www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

August 2013 • No.441

صنعتی انفجار کے زمانے میں معاشی محرومی کی شکایت کرنا ایسا ہی
ہے جیسے بارش کے زمانے میں پانی نہ ملنے کی شکایت کرنا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

جاری کردہ 1976

اگست 2013

فہرست

لعلہم یرشدون	2
خالص اللہ کے لیے عمل	3
سورہ العصر	4
حبطِ اعمال	6
انسان کی محرومی	8
فہم قرآن — ایک مطالعہ	10
اندھا اور بہرا ردعمل	31
مجھ کو قرآن نہیں ملا	32
دعوت، اجتماعیت	33
فکری مستوی کے مطابق خطاب	34
دریافت کی عظمت	39
کامیاب زندگی کا راز	40
مواقع ختم نہیں ہوتے	41
غلطی کا اعتراف	42
سوال و جواب	43

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly

1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Mob. 8588822679, 8588822680
Tel. 011-46521511, 41827083,
Fax: 011-45651771
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy ₹15
One year ₹150
Two years ₹ 300
Three years ₹ 450

By Registered Mail:
One year ₹400
Two years ₹ 800
Three years ₹1200
Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

لعلہم یرشدون

قرآن کی سورہ البقرہ میں ماہ صیام (رمضان) کے احکام بیان کیے گئے ہیں۔اِس سلسلے میں ایک آیت یہ ہے: وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ (2:186) یعنی جب میرے بندے تم سے میری بابت پوچھیں، تو میں نزدیک ہوں، پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب کہ وہ مجھے پکارتا ہے، تو چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر یقین رکھیں، تاکہ وہ ہدایت پائیں۔

'رشد' 'یرشد' کا مطلب ہے ہدایت پانا۔ القاموس المحیط میں اس کی تشریح 'اهتدی' کے لفظ سے کی گئی ہے، اور لسان العرب میں اِس کا مفہوم بتانے کے لیے 'أصاب وجهَ الأمر' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ انگریزی زبان میں کہا جائے گا: to find the truth دوسرے الفاظ میں، اِس کا مطلب ہے— سچائی کی دریافت۔

اصل یہ ہے کہ انسان کی شخصیت کے دو پہلو ہیں— جسم اور روح۔ جسم سے مراد آدمی کا مادی وجود ہے اور روح سے مراد اس کا ذہنی وجود ہے۔ روزے کے مہینے میں ایک شخص دن کے اوقات میں اپنے آپ کو کھانے اور پانی سے روکتا ہے۔ یہ عمل انسانی شخصیت کے مادی حصے کو دبانے (suppression) کے ہم معنی ہوتا ہے۔ دوسری طرف، یہ عمل انسانی شخصیت کے روحانی پہلو کو اٹھانے (uplift) کے ہم معنی ہے۔ اِس طرح آدمی اپنے آپ کو اِس کا اہل بناتا ہے کہ اس کی ذہنی اور روحانی صلاحیتیں بیدار ہوں، وہ برتر حقیقتوں کو دریافت کرنے کے قابل بن سکے۔ اِس طرح روزہ آدمی کو اِس قابل بناتا ہے کہ وہ مقصدِ اعلیٰ سے کم تر کسی سطح پر جینے کے لیے تیار نہ ہو۔

یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن کی مذکورہ آیت میں ''رُشد'' کہا گیا ہے۔ صحیح ہدایت (right guidance) ہر انسان کی پہلی ضرورت ہے۔ ہر عورت اور مرد کو چاہئے کہ وہ صحیح ہدایت پانے کو اپنا سب سے بڑا کنسرن (supreme concern) بنائے۔

خالص اللہ کے لیے عمل

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے کے بارے میں فرمایا: كل عمل بن آدم يضاعف الحسنة بعشر أمثالها إلى سبع مأة ضعف- قال الله تعالى: إلا الصوم، فإنه لي وأنا أجزي به، يدع شهوته وطعامه من أجلي (صحيح مسلم، رقم الحديث: 1151) یعنی انسان کے ہر عمل کا اجر دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھایا جاتا ہے۔ اللہ تعالی نے فرمایا: مگر روزہ کہ وہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ روزے دار میرے لیے اپنی شہوت کو اور اپنے کھانے کو چھوڑتا ہے۔

اِس حدیثِ رسول میں جس عظیم ثواب کا ذکر ہے، اس کا تعلق صرف روزے سے نہیں ہے، بلکہ توسیعی طور پر اُس کا تعلق ہر اُس عمل سے ہے جو للّٰہ یا لأجل اللّٰہ کیا گیا ہو، یعنی وہ عمل جو خالص اللہ کے لیے کیا جائے۔ یہ وہ عمل ہے جو اللہ سے بے پناہ تعلق کے تحت ظہور میں آتا ہے۔

ایک انسان جس کو اللہ کی اعلیٰ معرفت حاصل ہوئی ہو، جس کے اندر اللہ سے حبّ شدید (2:165) پیدا ہو گیا ہو، جو اللہ سے خوفِ شدید کی نفسیات میں جیتا ہو، جس کے تعلق باللہ نے اُس کا یہ حال کر دیا ہو کہ اللہ اس کا سول کنسرن (sole concern) بن گیا ہو، اللہ کی یاد جس کا سب سے بڑا سرمایہ بنا ہوا ہو، ایسا انسان اگر بظاہر ایک چھوٹا سا کام بھی خالصتاً اللہ کے لیے کرے تو داخلی اسپرٹ کے اعتبار سے، وہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ سارے زمین و آسمان بھی اس کا تحمل نہ کر سکیں۔

ایسا ایک عمل اپنی داخلی اسپرٹ کے اعتبار سے، کسی انسان کا عظیم ترین عمل ہوتا ہے۔ اس کی کیفیاتی قدر و قیمت (qualitative value) اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ کسی بھی پیمانے سے اس کو ناپا یا تولا نہیں جا سکتا۔ وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، انسان کی پوری شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ ربانی عمل کی وہ قسم ہے جب کہ بندہ اپنے آپ کو آخری حد تک اللہ کے آگے ڈال دیتا ہے۔ اُس وقت اللہ بھی اپنے لامحدود انعام کو اپنے بندے کے لیے مقدر کر دیتا ہے۔

سورہ العصر

سورہ العصر قرآن کی ایک چھوٹی سورہ ہے۔ اس کی صرف تین آیتیں ہیں۔ اس کا متن اور ترجمہ یہ ہے: وَالْعَصْرِ ○ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ○ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (103:1-3) یعنی زمانہ گواہ ہے کہ بے شک انسان گھاٹے میں ہے۔ سوا اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور عملِ صالح کیا، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔

قرآن کی یہ سورہ پورے قرآن کا خلاصہ ہے۔ امام شافعی نے کہا کہ: لو لم ینزل اللہ سوی هذه السورة، لكفت الناس۔ (صفوة التفاسير للصابوني: 3/60) یعنی اگر اللہ صرف اِس سورہ کو اتارتا تو یہی ایک سورہ لوگوں کی رہنمائی کے لیے کافی ہوجاتی۔

یہ بات بلاشبہہ درست ہے۔ لیکن سورہ العصر کا یہ فائدہ صرف اس کے ترجمے سے معلوم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ فائدہ صرف اُس وقت معلوم ہوتا ہے جب کہ اُس پر تدبر کیا جائے۔ قرآن کے تمام گہرے معانی صرف اُس انسان پر کھلتے ہیں جو تدبر کے شرائط کے ساتھ اس پر تدبر کرے۔

'عصر' کا لفظی مطلب زمانہ ہے۔ لیکن یہ لفظ یہاں تاریخ کے معنی میں ہے، یعنی انسانی تاریخ اپنے نتیجے کے اعتبار سے اِس بات کی گواہی دیتی ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے۔ 'خُسر' یہاں محرومی کے معنی میں ہے۔ اِس محرومی سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ ہیں جو ایمان اور عمل صالح کا ثبوت دیں، اور وہ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کی صفت اپنے اندر رکھتے ہوں۔

اِس آیت میں جس چیز کو ایمان اور عمل صالح اور حق وصبر کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، اُس کا مفہوم دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ وہ لوگ جو اللہ کے تخلیقی منصوبہ (creation plan) کو جانیں، وہ اِس حقیقت کو اِس طرح دریافت کریں کہ وہ اُن کے شعور کا حصہ بن جائے۔ اللہ کے اِسی منصوبۂ تخلیق کے مطابق، وہ اپنی شخصیت کی تعمیر کریں، وہ خود اپنی زندگی میں اس کو اختیار کریں

اور اِسی کے ساتھ وہ دوسروں کو بھی اِس کی تلقین کریں۔

مزید غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ سورہ العصر کا پیغام یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو امکانی طور پر ایک کامیاب انسان کی حیثیت سے پیدا کیا۔ لیکن تاریخ کا مشاہدہ بتاتا ہے کہ انسان نے اپنے حق میں اِس امکان سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس کے برعکس، اس نے یہ کیا کہ وہ گھاٹے اور محرومی کا کیس بن گیا۔

یہ واقعہ اللہ کی تقدیر کی بنا پر نہیں ہوا، بلکہ اِس لیے ہوا کہ انسان نے اللہ کے تخلیقی منصوبے کو نہیں سمجھا۔ اُس نے بطور خود اپنی زندگی کا نقشہ بنایا۔ اِس خود ساختہ رویے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان محرومی کا شکار ہو کر رہ گیا۔

انسان سے یہ مطلوب تھا کہ وہ اپنی زندگی کا مقصد اللہ کے تخلیقی منصوبے کی روشنی میں متعین کرے۔ اللہ جو اس کا خالق اور مالک ہے، اُسی کو وہ اپنا سب سے بڑا کنسرن (sole concern) بنائے۔ وہ محبت اور خوف کے جذبات کو اللہ کے لیے خالص کر دے۔ وہ صرف اللہ کا عبادت گزار بنے۔ اخلاقی معاملے میں وہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے اصول کی پابندی کرے۔ وہ اپنی انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی کو اللہ کے بتائے ہوئے نقشے کے مطابق تشکیل دے۔ وہ دنیا کو دار الامتحان سمجھے۔ وہ آخرت کی کامیابی کو اپنا نشانہ بنائے۔ وہ آخری حد تک جنت کا حریص ہو، وہ جہنم سے آخری حد تک ڈرنے والا بن جائے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ بیش تر لوگ اللہ کا مطلوب انسان بننے میں ناکام رہے۔ اُن کو یہ کرنا تھا کہ وہ دنیا سے رخصت ہوں تو وہ اللہ کے مطلوب انسان بن چکے ہوں، تاکہ موت کے بعد جب وہ اللہ کے سامنے کھڑے ہو تو اللہ انھیں رد نہ کرے، بلکہ وہ انھیں قبول کر لے۔ مگر بیش تر انسانوں کا کیس اِس معاملے میں، خسران کا کیس بن گیا۔

قرآن کی یہ سورہ جو ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں اتری، وہ گویا ایک انتباہ (warning) ہے۔ وہ انسان کو متنبہ کر رہی ہے کہ وہ اِس غلطی سے بچے۔ وہ اُن خوش قسمت انسانوں میں سے بنے جن کے لیے آخرت میں جنت کے دروازے کھولے جائیں گے۔

حبطِ اعمال

قرآن کی سورہ الحجرات میں آدابِ کلام کے ذیل میں کچھ ہدایات دی گئی ہیں۔ اِس سلسلے میں اس کی تین آیتوں کا ترجمہ یہ ہے: ''اے ایمان والو، تم اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو، اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ اے ایمان والو، تم اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے اوپر مت کرو اور اُس کو اِس طرح آواز دے کر نہ پکارو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھارے اعمال حبط ہو جائیں اور تم کو اس کا شعور بھی نہ ہو۔ جو لوگ اللہ کے رسول کے آگے اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں، وہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقوی کے لیے جانچ لیا ہے۔ ان کے لیے مغفرت اور اجرِ عظیم ہے''۔ (49:1-3)

قرآن کی اِن آیتوں میں پیغمبر کی مجلس کے حوالے سے ایک اہم اصول بیان کیا گیا ہے۔ اِس اصول کا تعلق پیغمبر کے زمانے میں پیغمبر کی مجلس سے بھی تھا اور بعد کے زمانے میں دوسری مجالس سے بھی ہے۔ پیغمبر کے زمانے میں کسی مجلس میں جو بات ہوتی تھی، وہ کیا تھی، وہ بلاشبہہ دین اور دعوت کی بات ہوتی تھی۔ گویا کہ قرآن کی مذکورہ ہدایت دینی مجلس کی نسبت سے ہے، نہ کہ محض ذاتِ رسول کی نسبت سے۔ ایسے موقع پر یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ تو سنجیدہ انداز میں اور متقیانہ انداز میں بولتے ہیں۔ یہی مطلوب انداز ہے۔ اِس کے برعکس، کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں کہ وہ غیر سنجیدہ انداز میں محض اپنے ذاتی ذہن کے تحت زور زور سے بولنے لگتے ہیں۔ یہ انداز ایک غیر مطلوب انداز ہے اور اِسی غیر متقیانہ روش سے قرآن کی اِس آیت میں منع کیا گیا ہے۔

دینی موضوع پر کلام کے وقت صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی شدت کے ساتھ قرآن وسنت کی پابندی کرتے ہوئے بولے۔ وہ ایسا نہ کرے کہ محض اپنے ذاتی خیال کو لے کر زور زور سے بولنے لگے۔ قرآن کی اِس آیت میں متقیانہ کلام کی ہدایت ہے اور غیر متقیانہ کلام کی ممانعت۔ متقیانہ کلام کو دوسرے الفاظ میں، سنجیدہ کلام (serious talk) اور غیر متقیانہ کلام کو غیر سنجیدہ کلام

(non-serious talk) کہا جاسکتا ہے۔ متقیانہ کلام وہ ہے جو اُس احساسِ ذمے داری کے ساتھ نکلے جو حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے ایک قول میں اِس طرح بیان کیا تھا: أي سماء تظلّني و أي أرض تقلني إذا قلتُ في كتاب الله ما لا أعلم (القرطبي: 19/221) یعنی کون سا آسمان مجھے سایہ دے گا اور کون سی زمین مجھ کو پناہ دے گی، اگر میں اللہ کی کتاب کے بارے میں ایسی بات بولوں جس کا مجھے علم نہیں (جس کی تائید میں میرے پاس کتاب اللہ کا کوئی حوالہ نہیں)۔

موجودہ زمانہ پرنٹنگ پریس کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانے میں اظہارِ خیال کا ذریعہ صرف بالمشافہ گفتگو نہیں ہے، بلکہ چھپی ہوئی تحریروں کی شکل میں اظہارِ خیال عام ہوگیا ہے۔ ایسی حالت میں، وسیع تر انطباق (extended application) کے اعتبار سے، تحریری اظہارِ خیال بھی اس میں شامل ہوگا۔ اِس معاملے میں متقیانہ تحریر وہ ہے جو اللہ کے سامنے جواب دہی (accountability) کے احساس کے تحت تیار کی گئی ہو۔ اِس کے برعکس، جو لوگ ایسا کریں کہ جو کچھ اُن کے ذہن میں ہے، اس کو لکھ کر چھاپنا شروع کردیں اور اس کی تحقیق نہ کریں کہ وہ کتاب وسنت کے مطابق ہے یا نہیں، ایسے لوگوں کے لیے شدید طور پر یہ خطرہ ہے کہ ان کی کوششیں حبطِ اعمال کا شکار ہوجائیں۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں بتایا گیا ہے کہ غیر متقیانہ کلام یا غیر ذمے دارانہ کلام کرنے والوں کے لیے حبطِ اعمال کا اندیشہ ہے۔ اِس حبطِ اعمال کی سنگینی یہ ہے کہ وہ غیر شعوری طور پر پیش آتا ہے، یعنی آدمی بطور خود یہ سمجھتا ہے کہ وہ حق وصداقت کی بات بول رہا ہے، لیکن نتیجہ (result) کے اعتبار سے، اس کی تقریر وتحریر سرتاسر عبث قرار پائے گی اور آدمی کو اِس کا شعور بھی نہ ہوگا۔ مزید غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، یہ معاملہ کنڈیشننگ (conditioning) کا معاملہ ہے۔ غلط افکار کے درمیان عرصے تک جینے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ آدمی کے ذہن کی تشکیل ایک خاص انداز سے ہوجاتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ سوچتا ہوں، وہ حق ہے، حالاں کہ وہ حق نہیں ہوتا، بلکہ صرف اس کے غلط مائنڈ سیٹ (mindset) کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں آدمی کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے ذہن کی ڈی کنڈیشننگ کرکے اپنے آپ کو صحیح الفکر انسان (right-thinker) بنائے۔

انسان کی محرومی

قرآن کی سورہ الاعراف میں انسان کی حالت پر ایک تبصرہ اِن الفاظ میں کیا گیا ہے: وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِيٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ○ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (7:175-176) یعنی اُن کو اُس شخص کا حال سناؤ جس کو ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں تو وہ اُن سے نکل بھاگا۔ پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو اس کو اُن نشانیوں کے ذریعے سے بلندی عطا کرتے، مگر وہ تو زمین کا ہو رہا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کرنے لگا۔ پس اس کی مثال کتّے کی سی ہے کہ اگر تو اُس پر بوجھ لاد دے تب بھی وہ ہانپے اور اگر چھوڑ دے تب بھی ہانپے۔ یہ مثال اُن لوگوں کی ہے جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا۔ پس تم یہ احوال اُن کو سناؤ، تاکہ وہ غور کریں۔

شانِ نزول کی روایت کے مطابق، قرآن کی اِس آیت میں ایک شخص کا قصہ بیان ہوا ہے۔ یہ حضرت موسیٰ کے زمانے کا ایک بڑا اسرائیلی عالم تھا جس کا نام بلعم بن باعوراء بتایا گیا ہے۔ مگر قرآن کے اسلوب کے مطابق، یہاں انفرادی حوالہ (particular reference) میں ایک عمومی بات کہی گئی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے علم میں ایسی نشانیاں (signs) آتی ہیں جو اس کو بتاتی ہیں کہ وہ اپنی زندگی کو اعلیٰ مقصد کے لیے استعمال کرے۔ لیکن شیطانی وسوسے کے زیر اثر وہ اپنی خواہشات سے مغلوب ہو جاتا ہے اور اُن چیزوں کو اپنا نشانہ بنالیتا ہے جس کے لیے وہ پیدا نہیں کیا گیا تھا۔

قرآن کی اِس آیت میں وہی بات کہی گئی ہے جو انسان کے حوالے سے دوسرے مقام پر اِن الفاظ میں آئی ہے: كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۙ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ (75:20-21)۔ اصل یہ ہے کہ انسان کی ذات میں تخلیقی طور پر ایسی نشانیاں ہیں جو بتاتی ہیں کہ اُس کو ایک اعلیٰ مقصد کے لیے

پیدا کیا گیا ہے۔ وہ اعلیٰ مقصد یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر ربانی شخصیت کی تعمیر کرے اور آخرت میں ابدی جنت کی صورت میں اس کا انعام پائے۔

مگر ''آج'' کے مواقع کو نظر انداز کر کے ''کل'' کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دینا انسان کو مشکل معلوم ہوتا ہے، اِس لیے وہ ایسا کرتا ہے کہ وہ آنے والے کل (tomorrow) کو نظر انداز کر دیتا ہے اور اُس فوری فائدہ کے حصول کو اپنا نشانہ بنا لیتا ہے جس کو آج کل 'رائٹ ہیئر، رائٹ ناؤ' (right here, right now) کہا جاتا ہے، اِس طرح انسان اپنے آپ کو اُس اعلیٰ کامیابی سے محروم کر لیتا ہے جو اُس کے خالق نے اس کے لیے مقدر کیا ہے۔

ایسے انسان کی مثال اُس کتے سے دی گئی ہے جس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر اس پر بوجھ لادا جائے تب بھی وہ ہانپے اور اگر چھوڑ دیا جائے تب بھی ہانپے۔ یہ تمثیل بہت بامعنی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی تخلیق کے اعتبار سے چوں کہ جنت کے لیے پیدا کیا گیا ہے، اِس لیے جنت کے سوا کوئی اور نشانہ اختیار کرنے کی صورت میں اس کی فطرت ہمیشہ غیر مطمئن رہتی ہے۔ پہلے مرحلے میں اُس کو یہ نشانہ بہت مشکل نظر آتا تھا کہ وہ نہ دکھائی دینے والی آخرت کی خاطر دکھائی دینے والی دنیا کو قربان کر دے۔ لیکن جب وہ دکھائی دینے والی دنیا کے حصول کے لیے اپنی پوری طاقت لگا دیتا ہے اور بظاہر اپنا نشانہ پورا کر لیتا ہے، تب بھی وہ غیر مطمئن رہتا ہے، کیوں کہ جس دنیوی چیز کو اُس نے پایا ہے، وہ اس کی اُس داخلی طلب کے مطابق نہیں جو فطری طور پر اس کے اندر موجود ہے۔

''یہ مثال اُن لوگوں کی ہے جنھوں نے ہماری نشانیوں کی تکذیب کی''۔ یہاں تکذیب سے مراد نظر انداز کرنا یا سبق نہ لینا ہے۔ انسان کا معاملہ یہ ہے کہ اُس کو ایک خدا طلب مخلوق (God-seeking being) کے طور پر پیدا کیا گیا ہے۔ جب وہ خدا کے سوا کسی اور چیز کو اپنا مقصود بناتا ہے تو بہت جلد اس کو عدم مطابقت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس کی فطرت یاد دلاتی ہے کہ یہ وہ چیز نہیں جو تمھارا اصل مقصود تھی، مگر آدمی شیطان کے زیر اثر فطرت کے اِن اشاروں کو نظر انداز کر دیتا ہے، وہ بدستور ایسا کرتا ہے کہ وہ غیر مقصود کو اپنا مقصود بنائے رہتا ہے۔ وہ اسی حال میں جیتا ہے، یہاں تک کہ مر کر اِس دنیا سے چلا جاتا ہے۔

فہمِ قرآن — ایک مطالعہ

قرآن، خدا کی محفوظ کتاب ہے۔ قرآن ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا۔ قرآن میں اس کے نزول کا مقصد اِن الفاظ میں بتایا گیا ہے: تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا (25:1) یعنی بہت بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر قرآن اتارا، تاکہ وہ جہان والوں کے لیے آگاہ کرنے والا ہو۔

قرآن ساتویں صدی عیسوی کے قدیم عرب میں اترا۔ اُس وقت وہ صرف امکانی طور پر نذیرِ عالم تھا۔ کیوں کہ بطور واقعہ نذیر عالم بننے کے لیے عالمی کمیونکیشن (global communication) کے ذرائع درکار ہیں، جو اُس وقت موجود ہی نہ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں یہ بات مستقبل کے اعتبار سے کہی گئی تھی، نہ کہ حال کے اعتبار سے۔ جیسا کہ معلوم ہے، قرآن کے نزول کے بعد انسانی تاریخ میں ایک انقلابی پراسس (revolutionary process) شروع ہوا۔ یہ عمل مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے تقریباً ایک ہزار سال کے بعد اپنے نقطۂ انتہا (culmination) تک پہنچا۔ یہ عالمی کمیونکیشن کا دور تھا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ قرآن کو نذیرِ عالم کی حیثیت سے ساری دنیا میں پہنچا دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید مواصلاتی دور، قرآن کو عالمی بنانے کا دور تھا:

The age of communication was the age of universalization of the Quran.

مگر ابھی یہ امکان واقعہ نہ بن سکا۔ اِس سلسلے میں یہاں یہاں ایک جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

ایک تاریخی جائزہ

قرآن جس زمانے میں اترا، اُس زمانے میں پرنٹنگ پریس موجود نہ تھا۔ لوگ قرآن کو یاد کر لیتے اور حافظہ کی مدد سے وہ اس کو پڑھتے یا دوسروں کو پڑھ کر سناتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات (632 عیسوی) تک یہ حال تھا کہ ہر جگہ صرف قرآن کا چرچا ہوتا تھا۔ آپ کی وفات کے بعد

حدیث کا چرچا بڑھ گیا۔ عباسی دور میں فقہ کا چرچا شروع ہوا۔ اس کے بعد اسی دور میں مسلم تاریخیں لکھی گئیں اور تاریخ کا چرچا ہونے لگا۔ اِس پورے زمانے میں باتیں یا تو حافظہ میں ہوتی تھیں یا ہاتھ سے لکھے ہوئے اوراق میں۔ چناں چہ فطرتی طور پر قرآن کا دائرہ اشاعت عملاً محدود رہا۔

پندرھویں صدی عیسوی میں پرنٹنگ پریس وجود میں آیا۔ اِسی کے ساتھ کاغذ بھی وسیع پیمانے پر بننے لگا۔ سولھویں صدی عیسوی میں یہ حال ہوا کہ یورپ میں کتابوں کی چھپائی عام ہوگئی۔ کتابوں کے مطبوعہ نسخے عمومی طور پر دستیاب ہونے لگے۔ مگر مسلم دنیا ابھی تک پرنٹنگ پریس سے ناآشنا تھی۔ اورنگ زیب عالم گیر سترھویں صدی کا مسلم بادشاہ ہے۔ مگر اپنے زمانے میں وہ صرف یہ جانتا تھا کہ لمبی مدت کے دوران قرآن کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر اس کا ایک نسخہ تیار کیا جائے۔ وہ پرنٹنگ ٹکنالوجی کی بابت کچھ نہیں جانتا تھا۔

مسلم دنیا میں پرنٹنگ پریس اٹھارھویں صدی کے آخر میں پہنچا۔ نپولین 1798 میں مصر میں داخل ہوا۔ وہ اپنے ساتھ فرانس سے پرنٹنگ پریس لایا تھا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں کرسچن مشنری کے لوگ انڈیا میں پرنٹنگ پریس لے آئے۔ اِس طرح دھیرے دھیرے پرنٹنگ پریس پوری مسلم دنیا میں پھیل گیا۔ بیسویں صدی میں یہ حال ہوا کہ قرآن کے چھپے ہوئے نسخے ہر جگہ پائے جانے لگے۔ گھر، مسجد، مدرسہ، لائبریری، کوئی جگہ قرآن کے مطبوعہ نسخوں سے خالی نہ رہی۔

مگر اب بھی جو حال ہوا، وہ صرف یہ کہ قرآن مسلمانوں کے لیے کتابِ تلاوت بنا رہا، وہ عمومی طور پر ساری انسانیت کے لیے عملاً نذیرِ عالم نہ بن سکا۔ ایسا کیوں ہوا، کیوں ایسا ہوا کہ عالمی اِبلاغ کے مواقع پیدا ہونے کے باوجود قرآن کی عالمی اشاعت نہ ہوسکی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ کام مسلمانوں کو انجام دینا تھا، جو کہ قرآن کے حامل ہیں، مگر اس زمانے کے مسلمان دعوت کے شعور سے مکمل طور پر خالی تھے۔ بیسویں صدی کے مسلمان ساری دنیا میں منفی سوچ کا شکار ہوگئے، وہ مدعو قوموں کو اپنا حریف سمجھنے لگے۔ اِس قسم کی منفی سوچ کے ساتھ دعوت وتبلیغ جیسا مثبت کام نہیں کیا جاسکتا۔

اصل یہ ہے کہ جس زمانے میں جدید کمیونکیشن کا دور آیا، اُسی زمانے میں ایک اور چیز مسلم دنیا میں

داخل ہوگئی، یعنی وہ چیز جس کو مغربی نوآبادیات (western colonialism) کہا جاتا ہے۔ جدید کمیونکیشن اور نوآبادیات دونوں ایک ساتھ مسلم دنیا میں داخل ہوئے:

The age of communication coincided with the age of colonialism.

مغرب کی نوآبادیاتی قومیں جدید طاقتوں سے مسلح تھیں۔ چناں چہ فطری طور پر یہ ہوا کہ وہ عمومی طور پر اُس زمانے کے مسلم ممالک پر غالب آ گئیں۔ انھوں نے مسلم اداروں اور مسلم حکومتوں کو زیر کرلیا۔ اِس کے ردعمل کے طور پر یہ ہوا کہ تمام دنیا کے مسلمان مغربی قوموں کے خلاف نفرت میں مبتلا ہو گئے۔ اُس زمانے کے تقریباً تمام مسلم رہنماؤں کا ذہن یہ بن گیا کہ سب سے پہلا کام یہ ہے کہ مغربی طاقتوں سے لڑکر اُن کو مسلم دنیا سے نکالو۔ اِس سیاسی جہاد میں تقریباً تمام لوگ شریک ہو گئے، صرف اِس فرق کے ساتھ کہ کچھ لوگ اُس میں فکری اعتبار سے شریک تھے اور کچھ لوگ مسلح ٹکراؤ میں مشغول تھے۔

یہ پورا دور مسلمانوں کے لیے منفی ردعمل کا دور تھا۔ نفرت اور تشدد کے ماحول میں وہ یہ بھول گئے کہ مغربی قومیں اُن کے لیے دشمن نہیں، بلکہ مدعو ہیں۔ تاریخ میں پہلی بار یہ امکان پیدا ہوا ہے کہ قرآن اور ترجمہ قرآن کے مطبوعہ نسخوں کو نہ صرف مغربی قوموں، بلکہ تمام دنیا کی قوموں تک پہنچا دیا جائے، تاکہ قرآن اپنے مقصد نزول کے اعتبار سے نذیرِ عالم بن جائے، یعنی وہ پیشین گوئی پوری ہو جس کو حدیث میں عالمی ادخالِ کلمہ کہا گیا ہے۔ مسلمانوں کے اندر دوسری قوموں کے لیے منفی ردعمل کا یہ مزاج انیسویں صدی کے نصف ثانی میں شروع ہوا اور اکیسویں صدی کے نصف اول تک منفی ردعمل کی یہ نفسیات بدستور جاری ہے۔

موجودہ زمانے کے مسلمانوں نے دوسری قوموں کو اپنا دشمن قرار دے کر جو لڑائی جاری کی، وہ ہر قسم کی بے پناہ قربانیوں کے باوجود مکمل طور پر بے نتیجہ رہی۔ کوششوں کا یہ منفی انجام کافی تھا کہ مسلمان اِس معاملے میں اپنے موقف پر نظر ثانی کریں۔ مگر عجیب بات ہے کہ کھلے ہوئے ناکام تجربے کے باوجود آج بھی مسلمانوں کے اندر اِس معاملے میں نظر ثانی کا عمل جاری نہ ہوسکا۔

قرآن سے ہدایت لینے میں ناکامی

موجودہ زمانے میں جب قرآن کے مطبوعہ نسخے عام ہوئے تو بہت بڑے پیمانے پر مسلمانوں میں قرآن کو پڑھنے کا رواج پیدا ہوگیا۔ مسجدوں اور راداروں میں درسِ قرآن کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ کتابوں اور جرائد کے ذریعے قرآنی تعلیمات کی اشاعت کی جانے لگی۔ قرآن کی تفہیم کے لیے جماعتیں بنیں اور ادارے قائم ہوئے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ مسلمانوں میں عمومی طور پر قرآنی ذہن بنے اور قرآنی طرز فکر پیدا ہو، مگر عجیب بات ہے کہ دروسِ قرآن کی کثرت اور قرآنی کتابوں کی عمومی اشاعت کے باوجود یہ مقصد حاصل نہیں ہوا۔

اِس کا اصل سبب یہ ہے کہ قرآن کو صرف پڑھنا کافی نہیں ہے، بلکہ ضروری ہے کہ اُس کو صحیح ذہن کے تحت پڑھا جائے۔ اِسی لیے قرآن میں کہا گیا ہے: يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا (2:26) یعنی جو لوگ صحیح ذہن کے ساتھ قرآن کو پڑھیں گے، اُن کو قرآن سے ہدایت ملے گی، اور جو لوگ بگڑے ہوئے ذہن کے ساتھ قرآن کو پڑھیں، وہ قرآن کو پڑھنے کے باوجود قرآن سے ہدایت پانے سے محروم رہیں گے۔

قرآن فہمی کا اصول

علماءِ تفسیر نے عام طور پر قرآن فہمی کے لیے 15 علوم میں مہارت کو ضروری قرار دیا ہے — علمِ لغت، علمِ نحو، علمِ صرف، علمِ اشتقاق، علمِ معانی، علمِ بیان، علمِ بدیع، علمِ قرأت، علمِ عقائد، علمِ اصولِ فقہ، علمِ اسبابِ نزول، علمِ ناسخ ومنسوخ، علمِ فقہ، علمِ حدیث، علم وہبی۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ صرف یہ علوم قرآن فہمی کے لیے کافی نہیں۔ بیسویں صدی عیسوی میں کثیر تعداد میں ایسے علما اٹھے جن کا مقصد قرآنی علم کو عام کرنا تھا۔ یہ علما مذکورہ تمام علوم کے ماہر تھے، مگر عین اِسی دور کے مسلمان ایک بہت بڑے قرآنی علم سے بے خبر رہ گئے۔ یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ قرآن فہمی کے لیے صرف مذکورہ علوم سے واقف ہونا کافی نہیں۔

مطلوب قرآنی علم وہ ہے جس کو کتاب اللہ میں ''فرقان'' (8:29) کہا گیا ہے۔ فرقان فرق کا مبالغہ ہے۔ اِس کا مطلب ہے: دو چیزوں کے درمیان فرق کرنے والا۔ قرآن کی ایک صفت یہ ہے کہ

وہ قاریِ قرآن کے اندر فرقان کی صفت پیدا کرتا ہے۔ وہ قاری کو اِس قابل بناتا ہے کہ وہ کسی چیز کے دو پہلوؤں کے درمیان فرق کر سکے۔ مثلاً وہ ایسا کر سکے کہ وہ کسی چیز کے پلس پوائنٹ کو اس کے مائنس پوائنٹ سے الگ کر کے دیکھ سکے۔

موجودہ زمانے میں نوآبادیاتی طاقتیں مغربی تہذیب کو لے کر مسلم دنیا میں داخل ہوئیں۔ اِس مغربی تہذیب کے دو پہلو تھے۔ ایک یہ کہ وہ مغربی قوموں کو مسلم دنیا میں غالب کر رہی تھیں۔ اور اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ یہ لوگ پہلی بار دنیا میں جدید مواقع لائے تھے، جن میں کمیونکیشن سرفہرست ہے۔ اب علماءِ قرآن کو چاہیے تھا کہ وہ اِن دونوں پہلوؤں کو الگ کر کے دیکھیں۔ وہ خُذ ما صفا ودَع ما کدر کے اصول پر مغربی تہذیب کے غیر مطلوب پہلو کو نظر انداز کر دیتے اور دعوتی مواقع کو بھرپور طور پر استعمال کرتے، مگر وہ ایسا نہ کر سکے۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ دورِ جدید کے علما اور رہنما اِس معاملے میں فرقان کی صفت سے محروم تھے، یعنی مغربی تہذیب کے مذکورہ دو پہلوؤں کے درمیان فرق کرنا۔ اُن کے مطالعہ قرآن نے اُن کے اندر یہ صلاحیت پیدا نہیں کی تھی کہ وہ مغربی تہذیب کے اندر چھپے ہوئے مثبت دعوتی پہلو کو اس کے دوسرے پہلو سے الگ کر کے دیکھیں اور دعوتی مواقع کے پہلو کو استعمال کر کے دورِ جدید میں اسلام کی عالمی دعوتی اشاعت کا کام انجام دے سکیں۔

ربانی شاکلہ

حقیقت یہ ہے کہ قرآن فہمی کے لیے مذکورہ 15 علوم کے علاوہ ایک اور ضروری چیز درکار ہے، اور یہی چیز دور جدید کے علما اور رہنماؤں کو حاصل نہ تھی، اور وہ ہے ربانی شاکلہ۔ اِس علم کا ذکر قرآن کی اِس آیت میں ملتا ہے: قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ۭ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا (17:84) یعنی کہو کہ ہر ایک اپنے شاکلہ پر عمل کر رہا ہے۔ اب صرف تمھارا رب بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ ٹھیک راستے پر قائم ہے۔

اِس آیت میں شاکلہ کا مطلب ذہنی سانچہ (mindset) ہے۔ قریبی حالات کے اعتبار سے،

ہر آدمی کا ایک ذہنی سانچہ بن جاتا ہے۔ وہ اِسی ذہنی سانچہ کی نظر سے چیزوں کو دیکھنے لگتا ہے۔ مگر یہاں ایک برتر ذہنی سانچہ ہے۔ یہ ذہنی سانچہ آدمی کو اِس قابل بناتا ہے کہ وہ حالات سے اوپر اٹھ سکے۔ وہ چیزوں کو اللہ کی روشنی سے دیکھنے لگے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: اتقوا فراسةَ المومن فإنه ينظر بنور الله (الترمذي، رقم الحديث: 3392)۔ یعنی مومن کی فراست سے بچو، کیوں کہ مومن، اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ اللہ کے نور سے دیکھنے کا مطلب ہے — چیزوں کو ربانی نقطۂ نظر سے دیکھنا۔

قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے سب سے زیادہ اہمیت اِسی ربانی شاکلہ کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی کتاب کو درست طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ قاری، مصنف کے ذہن سے کتاب کو پڑھ سکے۔ کسی بھی کتاب کو جب آدمی پڑھتا ہے تو وہ اس کو خود اپنے شاکلہ کے مطابق، پڑھتا ہے۔

ہوورڈ فاسٹ (Howard Fast) ایک کمیونسٹ تھا۔ خروشچف کے مشہور انکشاف (1956) کے بعد اس نے کمیونسٹ پارٹی کو چھوڑ دیا۔ وہ اصلاً ایک مارلسٹ (moralist) تھا۔ اس نے کمیونسٹ لیڈروں کی تحریریں پڑھیں تو اس کو محسوس ہوا کہ کمیونزم سماجی اخلاقیات کی ایک تحریک ہے، جب کہ حقیقت ایسی نہ تھی۔ بعد کو اس نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ میں خود اپنے ذہنی سانچے میں کمیونسٹ بنا:

I accepted communism according to my own mindset.

یہی معاملہ ہر انسان کا ہے۔ اگر آدمی کا ذہن بنا ہوا نہ ہو تو وہ قرآن کو خود اپنے ذہنی سانچے میں پڑھے گا۔ وہ قرآن کو پڑھ کر بھی قرآن کو نہیں پائے گا۔ یہی وہ بات ہے جو ایک صحابی نے اِن الفاظ میں کہی ہے: تعلمنا الإيمان ثم تعلمنا القرآن (یعنی ہم نے ایمان کو سیکھا، پھر ہم نے قرآن کو سیکھا)۔ صحابی کے اِس قول میں ایمان سیکھنے سے مراد یہ ہے کہ ہم نے پہلے اپنے ذہنی شاکلہ کی تشکیل ربانی اصول پر کی، پھر ہم اِس قابل ہوئے کہ ہم قرآن کو پڑھ کر اس کو درست طور پر سمجھ سکیں۔ ربانی شاکلہ کو دوسرے الفاظ میں، مثبت شاکلہ (positive mindset) کہا جاسکتا ہے۔

غیر قرآنی ذہن

ربانی شاکلہ کیا ہے۔ ربانی شاکلہ دراصل غیر متعصّبانہ طرزِ فکر (unbiased thinking) کا

دوسرا نام ہے۔ ایک آدمی جب ہر قسم کے تعصّبات سے باہر آ کر کھلے ذہن کے تحت سوچے تو اس کی سوچ فطری سوچ بن جاتی ہے۔ وہ، حدیث کے الفاظ میں، اللہ کے نور سے دیکھنے لگتا ہے۔ اِسی کا نام ربانی شاکلہ یا ربانی مائنڈ سیٹ (mindset) ہے۔ ربانی مائنڈ سیٹ کیا ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ دعا اِن الفاظ میں آئی ہے: اللهم أرنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه، وأرنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه، وأرنا الأشياء كما هي۔

اِس دعا کا خلاصہ ایک لفظ میں یہ ہے کہ — خدایا، تو مجھے توفیق دے کہ میں چیزوں کو ایز اِٹ اِز (as it is) دیکھنے لگوں، یعنی کسی آمیزش کے بغیر خالص فطری انداز میں۔ اِس سے مراد چیزوں کو اُس نظر سے دیکھنا ہے جس نظر سے خدا اُن کو دیکھتا ہے۔ اِسی طرزِ فکر کا نام ربانی طرزِ فکر ہے، اور یہ ربانی طرزِ فکر کسی آدمی کے اندر کامل ذہنی تطہیر کے ذریعے پیدا ہوتا ہے۔

انسانی شاکلہ اور ربانی شاکلہ کے فرق کی ایک مثال صلح حدیبیہ ہے، جس کی بابت قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: علم ما لم تعلموا (48:27) یعنی اللہ نے وہ جانا جو انسان نے نہیں جانا۔ حدیبیہ کا معاہدہ یک طرفہ شرطوں پر طے کیا گیا تھا۔ اِس بنا پر انسانی ذہن نے اس کو ذلت آمیز معاہدہ سمجھا۔ لیکن اللہ اس کو مستقبل میں دعوتی مواقع کھلنے کے اعتبار سے دیکھ رہا تھا، یعنی انسان اِس معاہدہ کو حال کی نسبت سے دیکھ رہا تھا، جب کہ خدا اس کو مستقبل کی نظر سے دیکھ رہا تھا، اِس بنا پر ایسا ہوا کہ جس چیز کو انسان شکست کا درجہ دے رہا تھا، اُس کو خدا نے فتحِ مبین کا درجہ دے دیا۔

ذہنی پردہ

قرآن کی سورہ الاسراء میں ایک آیت اِن الفاظ میں آئی ہے: وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُورًا (17:45) یعنی جب تم قرآن پڑھتے ہو تو ہم تمھارے اور اُن لوگوں کے درمیان ایک چھپا ہوا پردہ حائل کر دیتے ہیں، جو آخرت کو نہیں مانتے:

When you recite the Quran, we place an invisible barrier between you and those who do not believe in the Hereafter.

قرآن کی اِس آیت میں حجابِ مستور سے مراد غیر ربانی مائنڈ سیٹ ہے۔قرآن کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے اپنے غیر ربانی مائنڈ سیٹ کو توڑنا پڑتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، یہ کہ اپنے آپ کو کامل طور پر آبجکٹیو مائنڈ (objective mind) بنانا پڑتا ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلی شرط سلبی ہے، نہ کہ ایجابی۔

ایجابی ذہن کا مطلب ہے، قرآن کو قرآن کے ذہن سے پڑھنا۔ سلبی ذہن کا مطلب ہے، اپنے غیر قرآنی ذہن کی تطہیر کرنا۔ قرآن کے صحیح مطالعے کے لیے جو ترتیب ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی پہلے اپنے غیر قرآنی ذہن کے خول سے باہر آئے، اِس کے بعد ہی یہ ممکن ہوگا کہ وہ ایجابی ذہن کے تحت قرآن کو پڑھے اور اس کو سمجھ سکے۔ گویا کہ کلمۂ توحید (لا إله إلا الله) کی طرح یہاں بھی یہ اصول ہے کہ پہلے نفی کا مرحلہ ہے اور اس کے بعد اثبات کا مرحلہ، یعنی پہلے اپنے ذہن کے حجاب کو ہٹانا پڑتا ہے، اس کے بعد ہی کسی کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ قرآن کو پڑھے اور اس کے صحیح مفہوم تک پہنچ سکے۔

جس زمانے میں کمیونزم کا زور تھا، ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے قرآن کو پڑھا۔ وہ اشتراکی فکر سے متاثر تھے۔ وہ قرآن کو پڑھتے ہوئے اِس آیت تک پہنچے: إن الأرض لله (7:128)۔ اِس آیت کو پڑھ کر انھوں نے اپنے مائنڈ سیٹ کے مطابق، یہ سمجھ لیا کہ قرآن بھی اشتراکیت کی تعلیم دیتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اِس آیت میں کہا گیا ہے کہ زمین اللہ کی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ زمین اسٹیٹ کی ہے۔ اسٹیٹ کو یہ حق ہے کہ وہ لوگوں کی زمین پر قبضہ کرکے اشتراکی اصول پر زراعت کا نظام بنائے۔ اِسی طرح ایک اور تعلیم یافتہ مسلمان جو جمہوری فکر سے متاثر تھے، انھوں نے جب قرآن میں یہ آیت پڑھی: **وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ** (42:38) تو انھوں نے خوش ہو کر کہا کہ دیکھو، قرآن میں بھی جمہوریت (ڈیماکریسی) کی تعلیم موجود ہے۔

ایک اور تعلیم یافتہ مسلمان نے قرآن کی یہ آیت پڑھی: **فَأَوْقِدْ لِي يَا هَامَانُ عَلَى الطِّينِ فَاجْعَل لِّي صَرْحًا** (28:38)۔ اِن الفاظ کو پڑھ کر مذکورہ مسلمان نے کہا کہ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن سیر یمک انڈسٹری (ceramic industries) کی تعلیم دے رہا ہے۔

اِس کا تقاضا ہے کہ مسلمان سیریمک انڈسٹریز اور دوسری صنعتیں قائم کریں۔ وہ صنعت اور تجارت کے میدان میں آگے بڑھیں۔

اِس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ اگر قاری کا ذہن تیار ذہن نہ ہو تو وہ خود اپنے مائنڈ سیٹ کے مطابق، قرآن کو پڑھے گا۔ وہ قرآن کی آیتوں میں ایسی بات پالے گا جو خود قرآن میں موجود نہیں، بلکہ وہ خود اس کے اپنے ذہن میں پائی جاتی ہے۔

چند وضاحتی مثالیں

1۔ مصر کے مشہور انقلابی رہنما سید قطب کا نظریہ تھا کہ پیغمبروں کی دعوت کا نشانہ یہ تھا کہ وہ دنیا میں حکومتِ الٰہیہ قائم کریں۔ اِس ذہنی تاثر (obsession) کے تحت، انھوں نے قرآن کو پڑھا تو عجیب وغریب طور پر ان کو نظر آیا کہ قرآن اُن کے سیاسی ذہن کی تصدیق کر رہا ہے۔ مثلاً قرآن کی سورہ الاعراف میں بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ نے جب اُس وقت کے مصری حکمراں فرعون کے سامنے اپنی دعوت پیش کی تو فرعون نے اپنی جوابی تقریر میں اپنے درباریوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: يُرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ (7:110) یعنی موسیٰ چاہتے ہیں کہ وہ تم کو تمھارے ملک مصر سے نکال دیں۔

سید قطب نے جب اِن الفاظ کو پڑھا تو اپنے مائنڈ سیٹ کے مطابق، انھوں نے یہ سمجھا کہ حضرت موسیٰ کی دعوت ملک میں سیاسی اقتدار قائم کرنے کی دعوت تھی۔ چناں چہ وہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: إنها الخروج من الأرض، إنها ذَهاب السلطان، إنها إبطال شرعية الحكم، أو محاولة قلب نظام الحكم، بالتعبير العصري الحديث (3/1348) یعنی یہ سرزمینِ مصر سے نکلنے کا معاملہ ہے، یہ اقتدار کا خاتمہ ہے، یہ ہماری حکمرانی کو ناجائز ٹھہرانا ہے، یا یہ، دورِ جدید کی تعبیر کے مطابق، نظامِ حکومت کو بدلنے کی کوشش ہے۔

مذکورہ مصنف کے یہ الفاظ خود ان کے اپنے ذہن کی ترجمانی ہیں، وہ حضرت موسیٰ کی ترجمانی نہیں۔ واضح بات ہے کہ حضرت موسیٰ کا پیغام کلامِ موسیٰ سے نکلے گا، نہ کہ کلامِ فرعون سے۔ مگر اپنے متاثر ذہن کی بنا پر مصنف اِس فرق کو نہ سمجھ سکے۔ انھوں نے قرآن کی آیت کی ایسی تشریح کر دی جس کا تعلق

خود قرآن سے نہ تھا، بلکہ خود اُن کے اپنے مائنڈ سیٹ سے تھا۔

2۔ امام ابن تیمیہ کی ایک مشہور کتاب ہے۔ اس کا ٹائٹل یہ ہے: الصارم المسلول علی شاتم الرسول۔ اِس کتاب میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام میں شاتمِ رسول کی سزا قتل ہے۔ اُن کا دعوی ہے کہ یہ حکم قرآن کی متعدد آیتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً اِس سلسلے میں انھوں نے قرآن کی یہ آیت پیش کی ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ لَعَنَھُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ (33:57) یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں، اللہ نے اُن پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی۔

ابن تیمیہ آیت کی شرح میں لکھتے ہیں: وھذہ الآیۃ تو جب قتلَ مَن آذی اللہ ورسولہ (صفحہ 26) یعنی یہ آیت واجب قرار دیتی ہے کہ اُس شخص کو قتل کر دیا جائے جو اللہ کو اور اس کے رسول کو ایذا پہنچائے۔ مذکورہ آیت کی اِس شرح کا تعلق خود قرآن کی آیت سے نہیں ہے۔ اِس آیت میں شتمِ رسول پر قتل کا مسئلہ سرے سے بیان ہی نہیں ہوا ہے، مگر مصنف کے خود اپنے مائنڈ سیٹ کی بنا پر ایسا ہوا کہ انھوں نے ''اذیت'' کو شتم کے معنی میں لے لیا، اور ''لعنت'' کو قتل کے معنی میں۔ یہ دونوں باتیں خود مصنف کے دماغ میں تھیں، وہ ہرگز قرآن کی مذکورہ آیت میں موجود نہ تھیں۔

ربانی مائنڈ سیٹ کا معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہیں، وہ نہایت سنگین معاملہ ہے۔ اگر ربانی مائنڈ سیٹ نہ ہو تو آدمی قرآن کی رہنمائی سے محروم ہو جائے گا۔ وہ کسی مسئلے کو دیکھ کر اپنے مائنڈ سیٹ کی بنا پر اس کے بارے میں منفی رائے دے گا، حالاں کہ اُس مسئلے کے بارے میں قرآن میں مثبت نقطۂ نظر موجود ہوگا۔ مگر وہ اپنی منفی سوچ کی بنا پر قرآن کی اِس رہنمائی کو اخذ کرنے سے محروم رہے گا۔

مثلاً ایک عربی مجلہ میں مسلم اقلیتوں کے بارے میں ایک مضمون چھپا ہے۔ مضمون نگار نے اپنے اِس مضمون میں مسلم اقلیتوں (Muslim minorities) کے بارے میں یہ الفاظ لکھے ہیں: الأقلیات المسلمۃ تواجہ خطر الذوبان (مسلم اقلیتوں کے لیے غیر مسلم اکثریت میں جذب ہونے کے خطرے کا سامنا)۔ مسلم اقلیتوں کے بارے میں یہ تصور تمام تر خود ساختہ مائنڈ سیٹ کی بنا پر

پیدا ہوا۔ اگر اِس مسئلے کو ربانی شاکلہ کی نسبت سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کسی اقلیت کے بارے میں برعکس طور پر پُرامید تصور دیتا ہے۔ قرآن کی وہ آیت یہ ہے: كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ (2:249) یعنی کتنے ہی اقلیتی گروہ ہیں جو اکثریتی گروہ پر غالب آجاتے ہیں، اللہ کے اِذن سے۔

قرآن کی اِس آیت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جب دو گروہ کسی علاقے میں مشترک طور پر رہتے ہوں، ایک گروہ اقلیت میں ہو اور دوسرا گروہ اکثریت میں۔ ایسے ماحول میں یہ ہوتا ہے کہ اکثریتی گروہ، اقلیتی گروہ کے لیے ایک مسلسل چیلنج بن جاتا ہے۔ یہ چیلنج اقلیتی گروہ کے اندر فطری طور پر زیادہ سوچ اور زیادہ عمل کا مزاج بناتا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اقلیتی گروہ جو پہلے صرف ایک اقلیتی گروہ تھا، اب وہ ایک تخلیقی اقلیت (creative minority) بن جاتا ہے۔ اور یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ جس فرد یا جس گروہ میں تخلیقی صلاحیت پیدا ہوجائے، وہ زیادہ بڑے کارنامے انجام دینے کے قابل ہوجاتا ہے۔

اجتہادی تفسیر

اجتہادی تفسیر اور تفسیر بالرائے دونوں ایک تفسیر نہیں ہیں۔ تفسیر بالرائے ایک غیر مطلوب تفسیر ہے۔ اس کے مقابلے میں، اجتہادی تفسیر عین مطلوب تفسیر ہے۔ تفسیر بالرائے قرآن سے انحراف ہے، جب کہ اجتہادی تفسیر کامل معنوں میں قرآن کا اتباع ہے۔

اجتہادی تفسیر کیا ہے۔ اجتہادی تفسیر کا مطلب قرآن کی کسی آیت کی معنویت کو ازسرِنو دریافت کرنا ہے۔ اجتہادی تفسیر دراصل یہ ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں قرآن کا انطباقِ نو (re-application) معلوم کیا جائے۔ اجتہادی تفسیر، قرآن کے تسلسل کا اظہار ہے۔ صرف اجتہادی تفسیر کے ذریعے یہ ممکن ہے کہ قرآن ہر دور کے ذہن کو ایڈریس کرتا رہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انبیا اپنے وقت کے ملاء کو خطاب کرتے تھے۔ ملاء کا لفظ قرآن میں تقریباً 30 بار آیا ہے۔ ملاء کا مطلب ہے — سردارِ قوم (head of nation)۔

پیغمبر کا اسلوبِ دعوت یہ ہے کہ قبیلہ یا قوم کے سردار کو خصوصی طور پر خطاب کیا جائے۔ اِس حکمت کا سبب یہ ہے کہ ملاء کی حیثیت ذہن ساز (opinion-maker) کی ہوتی ہے۔ اِس لیے ملاء تک پیغام پہنچانا، بالواسطہ انداز میں، پورے گروہ تک پیغام پہنچانا ہوتا ہے۔

ملاءِ قوم کے اِس تصور کو اجتہادی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اِس سے ایک عظیم حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ موجودہ زمانے میں مغربی تہذیب کے علم برداروں کو یہی درجہ مل گیا تھا، وہ توسیعی معنوں میں گویا ملاءِ عالم بن گئے تھے۔ پھر انھوں نے جدید ذرائع اور جدید کمیونکیشن کو استعمال کر کے قائدِ عالم (world leader) کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔

دعوہ ورک کے لیے یہ واقعہ ایک عظیم امکان (great opportunity) کی حیثیت رکھتا تھا۔ تہذیب کے علم برداروں تک قرآنی پیغام پہنچانا، بالواسطہ طور پر سارے عالم تک قرآنی پیغام پہنچانے کے ہم معنی بن گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے کے رومی بادشاہ ہرقل کو ایک دعوتی خط بھیجا تھا۔ اس میں یہ الفاظ درج تھے: فإن تولیتَ فإن علیك إثم الأریسیین (اگر تم میری بات کو نہ مانو تو تمھارے اوپر تمھاری پوری قوم کی ذمے داری عائد ہو جائے گی)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رومی بادشاہ تک پیغام پہنچانا، اس کی پوری قوم تک پیغام پہنچانے کے ہم معنی تھا۔

اِسی طرح موجودہ زمانے میں مغربی تہذیب کے علم برداروں تک قرآن کا پیغام پہنچانا، بالواسطہ طور پر پورے عالم تک قرآن کا پیغام پہنچانے کے ہم معنی تھا۔ مگر عین اُس وقت یہ ہوا کہ بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر مسلم رہنما، مغربی تہذیب سے نفرت میں مبتلا ہو گئے۔ عرب سے عجم تک، تقریباً تمام مسلمانوں کا یہ حال ہوا کہ وہ مغربی قوموں سے نفرت کرنے لگے۔ انھوں نے مغرب کو مدعو کے بجائے عدو (دشمن) کا درجہ دے دیا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دورِ جدید کا ایک عظیم دعوتی امکان استعمال ہونے سے رہ گیا۔ موجودہ زمانے میں یہ حادثہ اِس لیے پیش آیا کہ مسلم علما قرآن کی تفسیر مجتہدانہ انداز میں نہ کر سکے۔ وہ قرآن کے دعوتی اسلوب کا جدید انطباق کرنے سے عاجز رہے۔ مجتہدانہ بصیرت، قرآن کے ابدی مفہوم کو سمجھنے کے لیے ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔

خدا کا تخلیقی منصوبہ

قرآن، خدا کی کتاب ہے۔ قرآن کو سمجھنے کے لیے ایک لازمی شرط یہ ہے کہ آدمی خدا کے تخلیقی منصوبہ (creation plan of God) کو جانتا ہو۔ خدا کی کتاب اور خدا کا تخلیقی منصوبہ دونوں کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں ہوسکتا۔ ضروری ہے کہ قرآن کا قاری قرآن کے اس پہلو کو شعوری طور پر جانے، ورنہ وہ قرآن کی ایسی تفسیر کرے گا جو خدا کے تخلیقی منصوبے سے مطابقت کرنے والی نہ ہوگی، اور اِس بنا پر وہ بداہۃً ہی قابلِ رد ہوگی:

Prima facie it stands rejected

اِس کی ایک مثال وہ تفسیر ہے جس کے مطابق، رسول پر شتم کرنا ایک ایسا فعل ہے جس پر شاتم مستوجبِ قتل ہوجاتا ہے۔ یہ نظریہ سرتاسر ایک غیر قرآنی نظریہ ہے۔ وہ خدا کے منصوبہ تخلیق سے مطابقت نہیں رکھتا۔ قرآن کے مطابق، اِس دنیا میں انسان کو کامل آزادی دی گئی ہے۔ اُس کو اختیار ہے، وہ چاہے تو اِس آزادی کا صحیح استعمال کرے اور چاہے تو وہ اِس آزادی کا غلط استعمال کرے (76:3)۔ آزادی کے غلط استعمال پر ضرور انسان کی پکڑ ہوگی، لیکن یہ پکڑ صرف آخرت میں ہوگی، دنیا میں ہرگز نہیں۔ ایسی حالت میں شاتم کے لیے قتل کی سزا مقرر کرنا، خدا کے منصوبۂ تخلیق میں ایک متناقض (inconsistent) حکم ہوگا، جب کہ قرآن خود اپنے بارے میں یہ اعلان کرتا ہے کہ اس میں کوئی تناقض نہیں (4:82)۔ قرآن کی صحیح تفسیر کے لیے یہ ایک لازمی شرط ہے۔ جو لوگ اِس معاملے میں باشعور نہ ہوں، وہ یقینی طور پر قرآن کی صحیح تفسیر کرنے میں ناکام رہیں گے۔

قرآن اور حدیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں سماجی جرائم (social crimes) پر سزا ہے۔ مثلاً چوری اور قذف، وغیرہ۔ مگر جہاں تک فکری جرائم (intellectual crimes) کا تعلق ہے، اُن پر اسلام میں کوئی جسمانی سزا (physical punishment) نہیں۔ فکری جرائم پر صرف دعوت وتبلیغ ہے، نہ کہ سزا۔ اِس معاملے میں قرآن کے یہ الفاظ انتہائی حد تک واضح ہیں: فَذَكِّرْ ۗ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ ○ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ○ إِلَّا مَنْ تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ○ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ

الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ○ إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ○ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (88:21-26)۔

غیر قرآنی ذہن کی تطہیر

اصل یہ ہے کہ ہر آدمی کسی ماحول میں پیدا ہوتا ہے۔ اپنے تجربے اور مطالعے کے مطابق، اس کا اپنا ایک ذہنی سانچہ (mindset) بن جاتا ہے۔ وہ اپنے اسی بنے ہوئے ذہن (conditioned mind) کے تحت چیزوں کو دیکھتا ہے اور رائے قائم کرتا ہے۔ اسی مائنڈ سیٹ کو قرآن میں شاکلہ (17:84) کہا گیا ہے۔ قرآن کو سمجھنے کی لازمی شرط یہ ہے کہ آدمی اپنے اِس ذاتی شاکلہ کو توڑے اور ربانی شاکلہ کی روشنی میں وہ قرآن کا مطالعہ کرے۔

مثال کے طور پر ہر آدمی کو اپنی زندگی میں کچھ منفی تجربات پیش آتے ہیں۔ اس کو لوگوں کی طرف سے ناخوش گوار تجربہ ہوتا ہے۔ اِن تجربات کی بنا پر تقریباً ہر آدمی کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ خارجی دنیا کے بارے میں منفی سوچ کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی تحریکیں لوگوں کے درمیان بہت جلد مقبول ہو جاتی ہیں جو کسی خارجی ظالم کے خلاف اٹھائی گئی ہوں۔ اِس ذہن کو لے کر جو آدمی قرآن کو پڑھے گا، وہ پوری طرح قرآن کو سمجھ نہیں سکتا۔ مثلاً وہ قرآن میں صبر کی تعلیم پڑھے گا۔ وہ پڑھے گا کہ اللہ کے یہاں صبر کرنے والے کو سب سے زیادہ ثواب (reward) ملے گا۔ وہ اپنے مخصوص ذہن کی بنا پر یہ سمجھے گا کہ قرآن ظالم کے مقابلے میں جھکنے کی تعلیم دیتا ہے۔ چناں چہ اس کو قرآن کی تعلیمات زیادہ اپیل نہیں کریں گی۔

اِس مسئلے کا حل یہ ہے کہ آدمی پہلے یہ دریافت کرے کہ اِس دنیا کے بارے میں خدا کا تخلیقی منصوبہ (creation plan) کیا ہے۔ وہ منصوبہ یہ ہے کہ اِس دنیا کو خدا نے دار الامتحان (testing ground) کے طور پر بنایا ہے۔ اِس بنا پر یہاں ہر انسان کو عمل کی پوری آزادی دی گئی ہے۔ ہر آدمی آزاد ہے، خواہ وہ اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرے یا غلط استعمال کرے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز جس کو فلاسفہ پرابلم آف اِول (problem of evil) کہتے ہیں، وہ دراصل پرابلم آف فریڈم (problem of freedom) ہے۔ چوں کہ اِس دنیا میں انسان کی آزادی کو منسوخ کرنا

ممکن نہیں، اِس لیے دنیا سے برائی کا کلی خاتمہ بھی ممکن نہیں۔

ایسی حالت میں اگر ایک شخص چیزوں کا آئڈیل معیار (ideal yardstick) اپنے ذہن میں رکھ کر قرآن کا مطالعہ کرے تو وہ قرآن کی تعلیمات کو سمجھ نہ سکے گا۔ قرآن کے مطابق، اِس دنیا میں جو چیز ممکن ہے، وہ فرد کی کامل اصلاح ہے، سماج کی کامل اصلاح اِس دنیا میں ممکن نہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے، آئڈیل معنوں میں انصاف پسند بنے، لیکن سماج کے معاملے میں وہ ورکنگ انصاف (working justice) پر راضی ہوجائے۔

فلسفیانہ ذہن کے تحت قرآن کا مطالعہ

اِس طرح اِس معاملے کی ایک اور مثال یہ ہے کہ فلسفیانہ ذہن کو لے کر اگر کوئی شخص قرآن کا مطالعہ کرے تو وہ قرآن کو سمجھنے میں ناکام رہے گا۔ فلسفیانہ ذہن یہ ہے کہ چیزوں کا کلّی علم حاصل کیا جائے۔ فلسفیانہ ذہن محدود علم پر راضی نہیں ہوتا۔ اِس کے برعکس، قرآن کا یہ کہنا ہے کہ: وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (17:85)۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے مضامین دو قسم کے ہیں ایک وہ جو ہماری معلوم دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور دوسرے مضامین وہ ہیں جو امورِ غیب سے متعلق ہیں۔ پہلے قسم کی باتوں کو محکم زبان میں بیان کیا گیا ہے، یعنی الفاظ میں جو بات ہے، وہی حقیقت میں بھی مطلوب ہے۔ محکم آیتوں پر غور کرکے اُن کی کلّی معنویت تک پہنچنا ممکن ہے۔

دوسری قسم کی آیتیں وہ ہیں جن کو قرآن میں متشابہات (3:7) کہا گیا ہے۔ یہ آیتیں وہی ہیں جو امورِ غیب سے تعلق رکھتی ہیں۔ اِن آیتوں میں مشابہت کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے، یعنی کسی بات کو تمثیلی زبان (allegorical language) میں بیان کرنا۔ اِن دوسری قسم کی آیتوں میں بیان کردہ باتوں کو صرف اِجمالی طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ اِس معاملے میں وہ اجمالی علم پر قناعت کرے، وہ اُس کی آخری کُنہ تک پہنچنے کی کوشش نہ کرے، ورنہ وہ کنفیوژن کا شکار ہوجائے گا۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں یہ الفاظ آئے ہیں: وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا (3:7)۔ اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ سچا علم رکھنے والے لوگ متشابہ آیتوں کی کُنہ تک

پہنچے کی سعی لا حاصل نہیں کرتے، بلکہ وہ اس کے اجمالی مفہوم کو مانتے ہوئے اس کی صداقت پر یقین کر لیتے ہیں۔قرآن کے مطالعے میں اِس اصول کوملحوظ رکھنا بے حدضروری ہے۔اِس کے بغیر قرآن کو درست طور پر سمجھنا ہرگز ممکن نہیں۔

قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے

ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من قال في القرآن برأيه، فأصاب، فقد أخطأ (الترمذي، رقم الحديث: 3183) یعنی جس نے قرآن کے بارے میں اپنی رائے سے کہا، اوراس نے صحیح کہا، تب بھی اس نے غلطی کی۔

اِس حدیث کی بنیاد پر کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ تفسیر بالرائے کا طریقہ مطلقاً غلط ہے، مگر اِس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے۔اِس حدیث میں تفسیر بالرائے کا مقابل تفسیر بالروایت نہیں، بلکہ اس کا مقابل تفسیر بالتدبر ہے۔اِس حدیث میں دراصل ذمے دارانہ تفسیر اور غیرے ذمے دارانہ تفسیر میں فرق کو بتایا گیا ہے۔حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے معاملے میں کسی شخص کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ کسی آیت کے بارے میں جو کچھ اُس کے ذہن میں آئے، بلا تحقیق وہ اُس کو بیان کرنے لگے۔ قرآن کی تفسیر کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جس آیت کی وضاحت کرنا ہے، پہلے اس کی تحقیق کی جائے۔تدبر کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد اُس پر لکھا یا بولا جائے گا۔

تفسیر بالرائے یہ ہے کہ آدمی کے ذہن میں پہلے سے ایک تصور (idea) موجود ہے۔اِس کے بعد وہ قرآن کو پڑھتا ہے۔اُس کو قرآن میں اپنی بات کے مشابہ ایک لفظ مل جاتا ہے اور پھر وہ کہتا ہے کہ دیکھو، میری بات خود قرآن میں موجود ہے۔مثال کے طور پر ایک شخص کے اندر سیاسی طرزِ فکر ہے۔ وہ سیاسی اقتدار کو سب سے بڑی چیز سمجھتا ہے۔اِس ذہن کو لے کر وہ قرآن پڑھتا ہے، پھر وہ اِس آیت تک پہنچتا ہے: إنِ الحكمُ إلا لله (12:40)۔ وہ فوراً کہہ اٹھتا ہے کہ سیاسی اقتدار کا تصور خود قرآن میں موجود ہے، قرآن کی اِس آیت میں بتایا گیا ہے کہ حکم صرف اللہ کا ہے۔اِس آیت کی سیاسی تفسیر کر کے وہ اس کو حکومتِ الٰہیہ کے معنی میں لے لیتا ہے اور پھر یہ دعوی کرتا ہے کہ ہمارا فرض ہے کہ

ہم لوگوں سے لڑکر دنیا میں خدا کی سیاسی حکومت قائم کریں۔ یہ بلاشبہہ تفسیر بالرائے ہے، کیوں کہ قرآن کی اِس آیت میں حکم سے مراد فوق الطبیعی (supernatural) حکم ہے، نہ کہ سیاسی حکم۔

قرآن کی مذکورہ آیت کی تفسیر کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ کے ذہن میں پیشگی طور پر جو تصور ہو، اُس کو لے کر آپ قرآن کو پڑھیں، اور پھر ایک مشابہ لفظ (حکم) پاکر یہ کہنے لگیں کہ دیکھو، قرآن بھی اِسی تصورِ سیاست کی تعلیم دے رہا ہے۔ یہ طریقہ بلاشبہہ تفسیر بالرائے کا طریقہ ہے۔

تفسیر کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ قرآن کی اِس آیت پر کھلے ذہن کے ساتھ تدبر کریں۔ آپ آیت کے سیاق (context) کی روشنی میں اس کا مطالعہ کریں۔ جب آپ ایسا کریں گے تو آپ پر یہ واضح ہوجائے گا کہ اِس آیت میں اصنام پرستی کے عقیدے کی تردید کی گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اِس آیت میں حکم (اقتدار) سے مراد وہ اقتدار ہے جو زمین اور آسمان میں براہِ راست طور پر خدا نے قائم کر رکھا ہے، یہاں اُس سیاسی اقتدار کا کوئی ذکر نہیں جس کو انسان دوسرے انسانوں کے مقابلے میں سماج کی سطح پر قائم کرتا ہے، یعنی خدا کا قائم کردہ فوق الطبیعی اقتدار، نہ کہ انسان کا قائم کردہ سیاسی اقتدار۔

قرآن کی تفسیر خواہ کسی بھی انداز میں کی جائے، ہمیشہ ایسا ہوگا کہ آدمی اپنی رائے کو استعمال کرے گا۔ رائے سے مراد عقلی غور وفکر ہے اور عقلی غور وفکر کے بغیر کوئی بھی تفسیر ممکن نہیں، حتی کہ تقلیدی تفسیر بھی نہیں۔ قرآن کی سورہ ص میں ارشاد ہوا ہے: كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (38:29) یعنی یہ ایک مبارک کتاب ہے جو ہم نے تمھاری طرف اتاری ہے، تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر تدبر کریں اور تاکہ عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔

تدبر کا مطلب غور وفکر (contemplation) ہے۔ قرآن میں تدبر یہ ہے کہ آپ کسی تعصب کے بغیر کھلے ذہن کے ساتھ قرآن کو پڑھیں، اس کے تمام پہلوؤں پر کسی تحفظِ ذہنی (reservation) کے بغیر غور کریں۔ آپ کا مقصد سچائی کی تلاش ہو، نہ کہ اپنی بات کو قرآن سے نکالنا۔ اِسی کے ساتھ آپ کو یہ اندیشہ لگا ہوا ہو کہ اگر آپ نے قرآن کی کسی آیت کی غلط تفسیر کی تو وہ خدا کے یہاں مقبول نہ ہوگی اور آپ اس کے لیے پکڑے جائیں گے۔ اِس طرح کی سنجیدہ فکر کے ساتھ جو تفسیر کی جائے، اسی کا نام تدبر ہے۔

اور تدبر کے ساتھ قرآن کی تفسیر کرنے کا طریقہ ہی تفسیر کا صحیح طریقہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں، غیر ذمے دارانہ تفسیر کا نام تفسیر بالرائے ہے، اور ذمے دارانہ تفسیر کا نام تفسیر بالتدبر۔

فہم قرآن

قرآن میں 114 سورتیں ہیں۔ اس کی سورہ نمبر 103 کا نام العصر ہے۔ سورہ العصر کے بارے میں امام شافعی (وفات: 820ء) کا مشہور قول ہے کہ: لو تدبر الناسُ هذه السورة، لوسعتهم (اگر لوگ سورہ العصر میں تدبر کریں تو یہی ایک سورہ ان کی ہدایت کے لیے کافی ہوجائے)۔ یہ بات بذاتِ خود بالکل درست ہے۔ تدبر قرآن، نہ صرف سورہ العصر کو سمجھنے کے لیے، بلکہ پورے قرآن کے فہم کی کلید ہے۔ لیکن قرآن میں تدبر کی دو سورتیں ہیں — ایک ہے، فنی تدبر، اور دوسرا ہے، عارفانہ تدبر۔ قرآن کے مطالعے کے لیے فنی تدبر صرف ابتدائی فہم قرآن کے لیے کارآمد ہے۔ جہاں تک گہرے فہم قرآن کا تعلق ہے، اس کا حصول صرف عارفانہ تدبر کے ذریعے ممکن ہوتا ہے۔

فنی تدبر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی لغت اور نحو اور صرف اور شانِ نزول، وغیرہ جیسی باتوں سے واقفیت رکھتا ہو۔ ایسا آدمی اِس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ وہ قرآن کے سادہ مفہوم کو بظاہر صحت کے ساتھ سمجھ لے، مگر جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: لكل آية منها ظَهْر و بطْن (الطبراني 105/10)۔ اِس قسم کا فہم قرآن کسی آدمی کو صرف ظہرِ قرآن سے واقف کراتا ہے، لیکن جہاں تک بطنِ قرآن کا معاملہ ہے، اُس سے آگاہ ہونے کے لیے صرف فنی واقفیت کافی نہیں۔ بطنِ قرآن تک رسائی حاصل کرنے کے لیے دین کی گہری معرفت ضروری ہے۔ یہ معرفت صرف اُس شخص کو ملتی ہے جو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ قرآن اور سنت کا مطالعہ کرے، جو لمبی مدت تک دعا اور ذکر الٰہی میں زندگی گزارے، وہ صبح وشام کے لمحات میں قرآن کا طالب بنا ہوا ہو، جس کا مسلسل غور وفکر اس کو معرفت (realization) کی اُس سطح تک پہنچا دے، جب کہ وہ فنی حد بندیوں سے اوپر اٹھ کر حقیقت کا ادراک کرنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ اُس وقت وہ اُس درجہ معرفت کو حاصل کرلیتا ہے جس کو حدیث میں "محدَّث" (صحيح البخاري، رقم الحديث: 3689) کہا گیا ہے۔

قرآن کی عارفانہ تفسیر

جیسا کہ عرض کیا گیا، علماءِ تفسیر نے قرآن کی تفسیر کے لیے 15 علوم کو ضروری قرار دیا ہے۔ اِن علوم میں سے ایک علم وہ ہے جس کو علمِ وہبی کا نام دیا گیا ہے۔ علمِ وہبی سے مراد معرفت ہے۔ بقیہ علوم کی حیثیت فنّی ہے اور معرفت وہ خصوصی صلاحیت ہے جس کو دوسرے الفاظ میں حکمت اور بصیرت (divine wisdom) کہا جاسکتا ہے۔ اِس حکمت اور بصیرت کی ایک مثال قرآن کی یہ آیت ہے: هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ (9:52) یعنی تم ہمارے لیے دو میں سے ایک بہتر چیز (one of the two good things) کا انتظار کر رہے ہو۔

قرآن کی اِس آیت میں ''دو بہتر میں سے ایک بہتر'' کا مطلب مفسرین نے عام طور پر فتح اور شہادت لیا ہے، یعنی تمھارے مقابلے میں ہم کو یا تو فتح حاصل ہوگی جو بلاشبہہ ایک بہتر چیز ہے، اور اگر تم نے ہم کو قتل کر دیا تو ہم شہادت کا درجہ پائیں گے، اور وہ بلاشبہہ ہمارے لیے ایک بہتر چیز ہے۔

خالص علم وفن کے اعتبار سے دیکھئے تو یہ تفسیر بالکل درست تفسیر معلوم ہوتی ہے، لیکن معرفت کے اعتبار سے دیکھئے تو یہ تفسیر ایک ناقص تفسیر ہے۔ فنی تفسیر کے اعتبار سے، اِس آیت کا تعلق جنگی صورتِ حال سے ہے۔ لیکن معرفت شناس ذہن یہ کہے گا کہ قرآن کا تعلق صرف جنگ سے متعلق احکام سے نہیں ہے، بلکہ قرآن کا تعلق انسان کی پوری زندگی سے ہے، اِس لیے ضروری ہے کہ 'إحدى الحسنين' کی سعادت ایک مومن کے لیے زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے اعتبار سے بھی قابلِ حصول ہو۔ اِس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک شخص سے وقتی طور پر آپ کی ملاقات ہوتی ہے۔ آپ کے لیے موقع تھا کہ آپ اس کے ساتھ حسنِ معاملت کریں اور ثواب کے مستحق قرار پائیں، لیکن کسی وجہ سے آپ اس کے ساتھ حسنِ معاملت نہ کر سکے۔ اِس صورتِ حال میں آپ کے لیے 'إحدى الحسنيين' کی سعادت حاصل کرنے کا موقع باقی ہے۔ وہ اس طرح کہ آپ یہ دعا کریں کہ — خدایا، میں فلاں انسان کے ساتھ حسنِ سلوک نہ کر سکا، تو میری اِس غلطی کو معاف فرما اور اُس انسان کے لیے میری طرف سے دعاءِ خیر لکھ دے اور اس کے حق میں میرے کوتاہی کی تلافی فرما۔

ایک شخص اگر فنی علوم کو حاصل کرلے تو وہ اِس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ قرآن کی کسی آیت کے ظاہری پہلوؤں کو بخوبی طور پر جان لے۔ اُس آیت کا لفظی ترجمہ کیا ہے، اس کا شانِ نزول کیا ہے، سیاق وسباق کی رعایت سے اس کا کیا مفہوم بنتا ہے اور کیا مفہوم نہیں بنتا، وغیرہ۔

ایک شخص جس کو فنی واقفیت حاصل ہو، وہ آیت کے ظاہری مفہوم کو سمجھ سکتا ہے، لیکن اُس آیت میں الفاظ کے ماورا جو حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں، وہ اُن سے بے خبر رہے گا۔ مثلاً وہ اِس بات کو جان لے گا کہ الحمد للہ رب العالمین کا لفظی ترجمہ کیا ہے۔ لیکن قرآن کی اِس آیت میں ایک اور گہرا پہلو چھپا ہوا ہے، لیکن اِس گہرے پہلو تک پہنچنے کے لیے صرف فنی واقفیت کافی نہیں۔

یہ گہرا پہلو وہ ہے جس کا علم صرف صاحبِ معرفت انسان کو ہوتا ہے، صاحب معرفت انسان وہ ہے جس نے اللہ کی عظمتوں کو دریافت کر رکھا ہو، جس کے غور وفکر نے اس کو اللہ کی کائناتی ربوبیت کی پہچان کرادی ہو، جو زمین وآسمان میں اس کی رحمتوں کا تجربہ کر رہا ہو۔ ایسا شخص جب الحمد للہ کہے گا تو اس کا شعورِ معرفت اِن الفاظ کے اندر معانی کا سمندر بھر دے گا۔ الحمد للہ رب العالمین کی تفسیر کرتے ہوئے اس کو محسوس ہوگا کہ انسائکلو پیڈیا کی وسیع جلدیں بھی اس کی تفسیر کے لیے ناکافی ہیں۔

قرآن کی فنی تفسیر قرآن کی صرف ٹکنکل تفسیر ہے، اور قرآن کی عارفانہ تفسیر، قرآن کی تخلیقی تفسیر (creative commentary) ہے۔ فنی صلاحیت کے لیے کتابی مطالعہ کافی ہوسکتا ہے، لیکن معرفت ایک خدائی عطیہ ہے۔ معرفت کسی انسان کو صرف خدا کی توفیق سے ملتی ہے، اور خدا کی توفیق اُس انسان کو حاصل ہوتی ہے جس نے خدا کو اپنا واحد کنسرن (sole concern) بنالیا ہو۔

قرآن فہمی کی شرط

قرآن کی سورہ الواقعہ میں، قرآن کے بارے میں یہ آیت آئی ہے: لا یمسّہ إلا المطہرون (56:79) یعنی قرآن کو صرف وہی لوگ چھوتے ہیں جو پاکیزہ ہیں:

None can touch the Quran except the purified.

اِس آیت کی تفسیر میں پاکیزہ سے کون لوگ مراد ہیں۔ کچھ لوگ اِس سے مراد فرشتوں کو

لیتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اِس سے مراد پاک اور باوضو لوگ ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اِس قسم کے مسائل اِس آیت کی نسبت سے غیر متعلق (irrelevant) مسائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِس آیت میں جو بات کہی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن کے معانی تک پہنچ صرف اُن لوگوں کے لیے ممکن ہوتی ہے جو پاکیزہ ذہن کے حامل ہوں۔

راغب الاصفہانی (وفات: 1108ء) نے اپنی کتاب المفردات میں اِس آیت کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے: إنه لا يبلغ حقائق معرفته إلا من طهّر نفسه (صرف وہ شخص معارف قرآن کے حقائق تک پہنچے گا جو اپنے نفس کی تطہیر کرے)۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس آیت میں پاکیزگی سے مراد اصلاً اخلاقی یا جسمانی پاکیزگی نہیں ہے، بلکہ اُس سے مراد ذہنی یا نفسیاتی پاکیزگی ہے۔

قرآن ایک ایسی ہستی کا کلام ہے جو کامل طور پر مثبت ذہن کا حامل ہے، وہ مکمل طور پر منفی سوچ سے پاک ہے۔ ایسی حالت میں، قرآن کو سمجھنے کے لیے یہ لازمی شرط ہے کہ قرآن کے قاری کا شاکلہ، قرآن کے مصنف کے شاکلہ کے ہم سطح ہو جائے۔ اِس کے بغیر کسی قاری کی پہنچ قرآن کے مضامین تک نہیں ہو سکتی۔ جو قاری اِس ذہنی ارتقا کا حامل ہو کہ اس کا ذہن مکمل طور پر مثبت ذہن (positive mind) بن چکا ہو، وہ منفی سوچ (negative thinking) سے پوری طرح خالی ہو۔ ایسے ہی انسان کی پہنچ قرآن کے گہرے معانی تک ہوگی۔ ایسے ہی انسان پر اللہ کی توفیق سے قرآن کے گہرے معانی کے دروازے کھلیں گے۔ (2012)

القرآن مشن، کشمیر

کشمیر میں موجود دعوتی مواقع کو استعمال کرنے کے لیے ایک منظم دعوتی مہم چلائی جا رہی ہے۔
جو حضرات اِس پروگرام میں شامل ہونا چاہتے ہیں، وہ حسب ذیل پتے پر رابطہ کریں:

Al-Quran Mission, Kashmir
Email: kwc.beerwah@gmail.com, Mob. 9419488008

اندھا اور بہرا ردعمل

قرآن میں اللہ کے بندوں کی صفات بتاتے ہوئے ان کی ایک صفت اِن الفاظ میں بیان کی گئی ہے: وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (25:73) یعنی وہ ایسے ہیں کہ جب اُن کے رب کی آیتوں کے ذریعے اُن کو نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اُن پر اندھے اور بہرے ہو کر نہیں گرتے۔

''اللہ کی آیتوں کے ذریعے تذکیر'' کا مطلب کیا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ایک انسان، جو قرآن کے الفاظ میں، اپنی خواہش کو اپنا رہنما بنائے ہوئے ہو، اس کی غلطی کی نشان دہی کرنا اور یہ بتانا کہ تم کو خدا کی دنیا میں خدا کی پسند کے طریقے پر چلنا ہے، نہ کہ اپنی پسند کے طریقے پر۔ اِس قسم کی نصیحت آدمی کو اپنے خلاف تنقید نظر آتی ہے۔ وہ اِس قسم کی نصیحت کو سننے کے بعد فوراً ردعمل کی نفسیات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ ایسی نصیحت کے جواب میں غیر سنجیدہ انداز اختیار کر لیتا ہے۔ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے بجائے خود ناصح کو غلط ثابت کرنا شروع کر دیتا ہے۔

وہ اُن پر اندھے اور بہرے ہو کر نہیں گرتے — اِس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ردعمل اندھے بہرے انسان کے ردعمل کی مانند نہیں ہوتا۔ اندھے اور بہرے انسان کی مانند ردعمل یہ ہے کہ آدمی نصیحت کو سن کر اُس کے جواب میں ایسا رسپانس دے جیسے کہ اس نے اصل بات کو نہ سنا اور نہ اس کو سمجھا، وہ ناصح کی اصل بات سے بے خبر رہ کر غیر متعلق باتیں بولنے لگا، وہ دلیل کے جواب میں الزام تراشی کرنے لگا، وہ ایک علمی بات کا جواب غیر علمی انداز میں دینے لگا، وہ نصیحت کے اصل نکتے پر دھیان دئے بغیر ایسی باتیں کہنے لگا جس کا ناصح کی نصیحت سے کوئی تعلق نہیں۔

اللہ سے تعلق آدمی کے اندر سنجیدگی پیدا کرتا ہے۔ اِس کے برعکس، جو انسان اللہ سے دور ہو، وہ ایک غیر سنجیدہ انسان بن جاتا ہے۔ وہ ایک ایسا انسان بن جاتا ہے جیسے کہ وہ آنکھ رکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھتا، وہ کان رکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں سنتا۔

مجھ کو قرآن نہیں ملا

سری نگر (کشمیر) میں ہمارے کئی ساتھی ہیں۔ وہ سیاحوں کو مطالعے کے لیے قرآن کا انگریزی ترجمہ دیتے ہیں۔ 7 اپریل 2013 کو وہ وہاں کے تولپ گارڈن (Tulip Garden) گئے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ سیاحوں کا ایک گروپ گیٹ سے اندر داخل ہو رہا ہے۔ انھوں نے ان لوگوں کو قرآن کا انگریزی ترجمہ دیا۔ یہ ترجمہ محدود تعداد میں تھا، اِس لیے وہ گروپ کے بعض افراد کو نہیں ملا۔ اِس کے بعد انھوں نے دیکھا کہ گارڈن کے گیٹ پر ایک نوجوان کھڑا ہوا رو رہا ہے۔ وہ رو رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا— مجھ کو قرآن نہیں ملا۔

یہ واقعہ مجھ کو معلوم ہوا تو میں نے سوچا کہ یہ کوئی سادہ واقعہ نہیں۔ یہ واقعہ حاملینِ قرآن کے لیے ایک عظیم انتباہ (warning) کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ واقعہ حاملینِ قرآن کو ان کی ذمے داری یاد دلا رہا ہے۔ وہ وقت آنے والا ہے جب کہ حشر کے میدان میں تمام پیدا ہونے والے انسان اکٹھا ہوں گے۔ اُس وقت اگر ایسا ہو کہ جن لوگوں تک قرآن نہیں پہنچا، وہ کھڑے ہو کر اللہ سے فریاد کریں کہ جن لوگوں پر یہ ذمے داری ڈالی گئی تھی کہ وہ خدا کی کتاب (قرآن) کو تمام انسانوں تک پہنچائیں، انھوں نے اپنی یہ ذمے داری پوری نہیں کی۔ انھوں نے لوگوں کی قابلِ فہم زبان میں خدا کی کتاب کو اُن تک نہیں پہنچایا۔ ایسی حالت میں سب سے پہلے اِن حاملین قرآن کی پکڑ ہونی چاہئے، نہ کہ ہماری۔

اگر حشر کے میدان میں یہ واقعہ پیش آئے کہ جن لوگوں تک قرآن نہیں پہنچا، وہ وہاں کھڑے ہو کر اللہ سے فریاد کریں تو حاملینِ قرآن کے پاس اِس کا کیا جواب ہوگا۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ قیامت میں دونوں گروہوں سے یہ سوال کیا جائے گا کہ پہنچانے والوں نے پہنچایا، یا نہیں، اور یہ کہ جن کو پہنچایا جانا تھا، اُن کو ملا، یا نہیں (7:6)۔ قرآن کا مذکورہ بیان داعی اور مدعو دونوں کے لیے بے حد اہم ہے۔ دونوں کو یہ سوچنا ہے کہ حشر کے میدان میں وہ اِس معاملے میں اللہ کے سامنے بری الذمہ قرار پائیں گے یا نہیں۔

دعوت، اجتماعیت

داعی یا مصلح کا ایک کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کو سچائی کی بات بتائے۔ وہ لوگوں کو امرِ حق سے باخبر کرے۔ اِس کام کا تقاضا یہ ہے کہ داعی اور مصلح سچائی کا گہرا علم رکھتا ہو۔ وہ ایسی زبان میں کلام کرے جو لوگوں کے دماغ کو اپیل کرنے والی ہو۔ اس کا دعوتی کلام اپنی زبان اور اپنے اسلوب، دونوں کے اعتبار سے، مخاطب کے لیے پوری طرح قابلِ فہم ہو۔ اس کے کلام میں وضوح (clairty) ہو۔ اس کا کلام کنفیوژن سے مکمل طور پر پاک ہو۔ دعوت اور اصلاح کی کوشش کے نتیجے میں جب کچھ لوگ اس سے متاثر ہوں اور وہ کم یا زیادہ تعداد میں اس کے گرد اکھٹا ہو جائیں تو اس کے بعد داعی کی ایک اور ذمے داری شروع ہو جاتی ہے، یہ کہ وہ اِن متاثر افراد کو قریب کرے اور ان کی اجتماعیت کو برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرے۔ دعوت اور اصلاح کی اِس دوسری ضرورت کو قرآن کی ایک آیت میں بتایا گیا ہے۔ اِس آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''(اے رسول) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم اُن کے لیے نرم ہو۔ اگر تم تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمھارے پاس سے بھاگ جاتے''۔ (3:195)

متاثر افراد کے درمیان اجتماعیت کو برقرار رکھنے کے لیے بنیادی صفت یہ ہے کہ داعی لوگوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرے، وہ اُن کے ساتھ سخت معاملہ نہ کرے۔ اِس کو ایک لفظ میں، لوگوں کے مزاج کی رعایت کہا جا سکتا ہے۔ جب بھی کچھ لوگ اکھٹا ہوں تو اُن کی طرف سے بار بار ایسی باتیں پیش آتی ہیں جو ناگواری کا پہلو لیے ہوتی ہیں۔ جہاں اجتماعیت ہو، وہاں لازمی طور پر مسائل بھی ہوتے ہیں، کیوں کہ ہر آدمی کا مزاج الگ الگ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں، اجتماعیت کو برقرار رکھنے کی تدبیر صرف یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا جائے۔ ان کی ناگوار باتوں کو نظر انداز کیا جائے۔ ایسے پروگرام رکھے جائیں جو لوگوں کے درمیان آپس کے تعلقات بڑھانے والے ہوں۔ مثلاً سادہ طور پر اجتماعی کھانا، وغیرہ۔

دعوت اور اصلاح کے کام میں یہ دوسرا پہلو عملی اعتبار سے بہت زیادہ اہم ہے۔ نظریاتی صداقت کے ساتھ اجتماعی حکمت اگر موجود نہ ہو تو کوئی بڑا کام نہیں کیا جا سکتا۔

فکری مستویٰ کے مطابق خطاب

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بُعثنا معاشر الأنبياء نخاطب الناس، على قدر عقولهم (المقاصد الحسنة للسخاوي، رقم الحديث: 120) یعنی تمام پیغمبروں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو اُن کے عقلی معیار کے مطابق، خطاب کریں۔

اِس حدیث میں 'قدرِ عقل' سے مراد فکری مستوی (intellectual level) ہے، یعنی لوگوں سے ایسی زبان میں خطاب کرنا جو اُن کے لیے قابلِ فہم ہو اور ان کے ذہن کو ایڈریس کرے۔ جس دعوتی خطاب میں مدعو کی یہ رعایت شامل نہ ہو، وہ مطلوب دعوتی خطاب نہیں۔ اِس حدیثِ رسول کا ایک تقاضا یہ ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان اگر ذہنی بُعد (intellectual gap) پیدا ہو جائے تو داعی کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو اِس طرح تیار کرے کہ مدعو کے ذہن کے اعتبار سے، اس کا کلام ایک موثر کلام بن جائے۔

موجودہ زمانے کی نسبت سے ایک بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مسلم علما اپنی تعلیم کے اعتبار سے، صرف روایتی ذہن کو خطاب کرنا جانتے ہیں۔ اِس بنا پر جدید تعلیم یافتہ طبقہ، علما کی پہنچ سے باہر ہو گیا ہے۔ علما کا روایتی طرزِ خطاب جدید ذہن کو اپیل نہیں کرتا۔ ایسی حالت میں علما کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو اِس طرح تیار کریں کہ وہ جدید ذہن کو خطاب کرنے کے قابل ہو سکیں۔

جدید فکری مستوی کوئی پراسرار چیز نہیں، وہ دراصل عقلی مستوی (rational level) کا دوسرا نام ہے۔ آج کا انسان صرف اُس کلام سے متاثر ہو سکتا ہے جو جدید عقلی معیار پر پورا اترتا ہو، جو دورِ جدید کے مسلّمات سے مطابقت رکھنے والا ہو، جو دینی حقائق کو عقل کے معروف اصولوں پر ثابت شدہ بناتا ہو۔ قدیم اسلوب کو اگر روایتی اسلوب کہا جائے تو جدید اسلوب کو سائنسی اسلوب کہا جائے گا۔

جو بات مذکورہ حدیثِ رسول میں کہی گئی ہے، اس کی اصل خود قرآن میں موجود ہے۔ قرآن کی سورہ ابراہیم میں یہ آیت آئی ہے: وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ

لِيُبَيِّنَ لَهُم (14:4) یعنی ہم نے جو پیغمبر بھی بھیجا، اس کی قوم کی زبان میں بھیجا، تاکہ وہ اُن سے اچھی طرح بیان کردے:

> And We have not sent any Messenger except with the language of his people in order that he might make the message clear to them.

قرآن کی یہ آیت پیغمبر کے حوالے سے ہر دور کے تمام داعیوں کے لیے ہے۔ بعد کے زمانے میں اپنے ہم عصر مخاطبین کی نسبت سے داعیوں کی بھی وہی ذمے داری ہے جو قدیم زمانے میں اپنے ہم عصر مخاطبین کی نسبت سے پیغمبروں کی ذمے داری تھی۔ قرآن کی اِس آیت کے مطابق، دعوت الی اللہ کے سلسلے میں داعی کی ذمے داری صرف یہ نہیں ہے کہ وہ مدعو کی زبان میں بول کر اس کو دعوت کا پیغام دے دے۔ اِسی کے ساتھ لازمی طور پر وہ چیز بھی ضروری ہے جس کو قرآن کی مذکورہ آیت میں ''تبیین'' کہا گیا ہے۔ تبیین کا مطلب ہے واضح کرنا، بات کو پوری طرح قابلِ فہم بنا دینا۔

اِس سے معلوم ہوا کہ داعی کے لیے صرف مدعو کی زبان کا جاننا کافی نہیں، اِسی کے ساتھ ضروری ہے کہ وہ مدعو کے مزاج کو سمجھے، وہ مدعو کی ذہنی ساخت کے مطابق، اُس سے خطاب کرے، تاکہ اس کا ذہن ایڈریس ہو سکے۔ اِس اعتبار سے دیکھئے تو موجودہ زمانے میں داعی کی ذمے داری بہت بڑھ گئی ہے۔ قدیم زمانہ اگر روایتی اسلوب کا زمانہ تھا تو موجودہ زمانہ سائنٹفک اسلوب کا زمانہ ہے۔ آج کا مدعو کسی بات کو صرف اُس وقت سمجھ پاتا ہے جب کہ اُس بات کو عقلی اسلوب میں مدعو کے سامنے پیش کیا جائے۔ اِس شرط کا تقاضا ہے کہ داعی نہ صرف آج کی زبان سیکھے، بلکہ وہ آج کے ذہن کو پوری طرح سمجھے اور جدید ذہن کو سمجھنے کا یہ کام صرف اُس وقت ممکن ہے جب کہ انتہائی بے تعصّبانہ انداز میں جدید افکار کا مطالعہ کیا جائے۔ یہ کام صرف اُس وقت ممکن ہے جب کہ داعی کے دل میں مدعو کے لیے کامل خیر خواہی موجود ہو۔ اگر کامل خیر خواہی موجود نہ ہو تو نہ زبان کا جاننا کافی ہو سکتا ہے اور نہ جدید علوم کا مطالعہ۔

اِس معاملے کی ایک مثال یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے تمام علما مستشرقین (orientalists) کے بارے میں منفی رائے رکھتے ہیں۔ وہ مستشرقین کو اسلام کا دشمن اور اسلام کے خلاف سازش کرنے والا

قرار دیتے ہیں، حتی کی ایک عرب عالم نے مستشرقین کو دورِ جدید کے تین اژدہوں میں سے ایک اژدہا قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: أجنحة المكر الثلاثة، تاليف: عبد الرحمن حبنكه الميداني)

مستشرقین کے بارے میں یہ رائے یقینی طور پر درست نہیں۔ اصل یہ ہے کہ مسلم علما، مغربی مستشرقین کو غیر متعصّبانہ ذہن کے ساتھ نہ پڑھ سکے، اِس لیے وہ اُن کے کیس کو بھی سمجھنے سے قاصر رہے۔ مستشرقین کے کیس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس فرق کو سمجھا جائے جو مسلم علما اور مستشرقین کے درمیان پایا جاتا ہے۔ مسلم علما دین اسلام کو وحی (revelation) کے ظاہرہ کے تحت دیکھتے ہیں۔ اِس کے برعکس، مستشرقین اپنے طریقِ مطالعہ کے تحت دینِ اسلام کو صرف ایک سماجی ظاہرہ (social phenomenon) یا تاریخی ظاہرہ (historical phenomenon) کے طور پر دیکھتے ہیں۔ طریقِ مطالعہ کے اِس فرق کی بنا پر فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ دونوں کی رائے میں کچھ فرق واقع ہوجاتا ہے۔ یہ فرق یقینی طور پر کسی سازشی ذہن یا بدنیتی کی بنا پر نہیں ہوتا، بلکہ وہ صرف طریقِ مطالعہ (method of study) میں فرق کی بنا پر ہوتا ہے۔

استشراق کی حقیقت

استشراق (orientalism) کیا ہے، استشراق اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، صرف ایک چیز کا نام ہے، وہ یہ ہے کہ نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کے بعد مختلف اسباب سے یورپ میں ایک ذہن ابھرا جس کو روحِ تجسس (spirit of inquiry) کہا جاتا ہے۔ اِس روحِ تجسس نے مزید ترقی پاکر موضوعی طریقِ مطالعہ (objective method of study) کا عنوان اختیار کیا۔ نشاۃِ ثانیہ کے بعد یورپ میں پیدا ہونے والے تمام علوم، خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیکولر، وہ اصلاً اِسی طریقِ مطالعہ کی پیداوار ہیں۔ اِس طریقِ مطالعہ کا استعمال بنیادی طور پر دو بڑے میدانوں میں ہوا— ایک، علمِ فطرت (natural sciences) اور دوسرا، علمِ انسانیات (humanities)۔ اِس طریقِ مطالعہ سے بہت زیادہ فائدے حاصل ہوئے۔ ہر شعبے میں نئی نئی حقیقتیں سامنے آئیں، تحقیق کے نئے نئے دروازے کھلے، سوالات کے نئے نئے جوابات ملے، زندگی کے لیے نئی نئی رہنمائیاں حاصل ہوئیں۔ تاہم

علم کے دونوں شعبوں میں ایک بنیادی فرق تھا۔ علمِ فطرت کا میدان فطرت کے اٹل قوانین تھے۔ اس میں یہ ممکن تھا کہ علمِ ریاضی (mathematics) کے قطعی فارمولے کو استعمال کرتے ہوئے قطعی نتیجے تک پہنچا جائے اور اگر بالفرض کوئی انسان اپنے اندازے میں غلطی کر جائے تو دوسرا انسان مزید تجزیہ کے ذریعے اس کی تصحیح کر سکے۔ اِسی لیے اِن علوم کو قطعی علوم (exact sciences) کہا جاتا ہے۔

لیکن علم انسانیات، بہ شمول مذہب، میں اِس کے استعمال کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ اِس شعبے میں حتمی نوعیت کا کوئی ریاضیاتی طریقہ قابلِ حصول نہ تھا، اِس لیے یہاں لازمی طور پر یہ ہونا تھا کہ انسانیات کے شعبے میں مطالعہ کرنے والوں کی رائے میں اختلاف پیدا ہو، وہ کسی معاملے میں غلط استنباط (wrong inference) کا شکار ہو جائیں۔ اِس بنا پر یہ ممکن ہی نہ تھا کہ انسانیات کے دائرے میں مطالعہ کرنے والا انسان کوئی ایسا اصول وضع کر سکے جس میں سرے سے کوئی غلطی نہ پائی جاتی ہو۔ انسانیات کے مطالعے میں جو غلطیاں پائی جاتی ہیں، وہ اختلافِ رائے کی بنا پر ہیں، نہ کہ سازش یا بدنیتی کی بنا پر۔ یہی استشراق کا معاملہ ہے۔ استشراق کا کیس ایک طریقِ مطالعہ کا کیس ہے، نہ کہ سازش یا بدنیتی کا کیس۔

اِس معاملے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ مستشرقین کے اِس ذہن کو مدعو کے ذہن کے طور پر لیا جائے، نہ کہ کسی دشمن کے سازشی ذہن کے طور پر۔ ہر مدعو کی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ اِس طرح مستشرقین کا کیس بھی مدعو کا کیس ہے اور ان کی بھی اپنی ایک سوچ ہے۔ اگر ہم مستشرقین کے کیس کو مدعو کے کیس کے طور پر لیں تو ہمارے دل میں اُن کے بارے میں وہی خیر خواہی پیدا ہو جائے گی جو ہر مدعو کے لیے ایک داعی کے دل میں ہوتی ہے۔ اِس طرح یہ ممکن ہو جائے گا کہ ہم مستشرقین کے ذہن کو غیر جانب دارانہ انداز میں سمجھیں اور اُن سے داعیانہ ذہن کے تحت ڈسکشن کریں اور اُن کو اسلام کا فطری پیغام پہنچائیں۔ مستشرقین بھی انسان ہیں۔ اُن کے اندر بھی وہی فطرت موجود ہے جو دوسرے انسانوں کے اندر پائی جاتی ہے۔ اگر اُن کی فطرت ایڈریس ہو جائے تو اُن کے ساتھ وہی واقعہ پیش آ سکتا ہے جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (41:34)

تاریخ بتاتی ہے کہ مستشرقین کے معاملے میں اِس طرح کے واقعات بار بار پیش آئے ہیں۔ بہت سے ایسے مستشرق ہیں جنھوں نے اسلام کا مطالعہ کیا۔ وہ اسلام کی صداقت سے متاثر ہوئے اور انھوں نے اسلام کے بارے میں بہت سی اعلیٰ کتابیں لکھیں۔ مثلاً ٹامس کارلائل (وفات: 1881)، ٹی ڈبلو آرنلڈ (وفات: 1930)، فلپ کے ہٹی (وفات: 1978)، وغیرہ۔ کچھ اور لوگ ہیں جنھوں نے اسلام کے تفصیلی مطالعے کے بعد باقاعدہ اسلام قبول کرلیا۔ مثلاً ہنگری کے عبدالکریم جُرمانوس (وفات: 1979)، وغیرہ۔

مستشرق عام طور پر اُس کو کہا جاتا ہے جو کسی مغربی ملک میں پیدا ہوا ہو اور پھر وہ مشرقی مذاہب کا مطالعہ کرے۔ لیکن توسیعی طور پر اِس فہرست میں ایسے افراد بھی شامل کیے جاسکتے ہیں جو کسی دوسرے مذہب میں پیدا ہوئے ہوں اور پھر وہ مختلف مذاہب کا مطالعہ کریں اور مطالعہ کے بعد اسلام قبول کرلیں۔ اِس دوسری قسم میں بھی بہت سے افراد پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر نشی کانت چٹوپادھیائے، وغیرہ۔ ڈاکٹر نشی کانت چٹوپادھیائے کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

Chattopadhyay, Nishikanta(1852–1910) research scholar and the first Bengali to obtain a PhD degree(1882) from a European university, was born in July 1852 in the village of Pashchimpara in Vikrampur, Dhaka. Nishikanta passed the FA from Presidency College. He then went to Germany to study German, Sanskrit, linguistics, history and philosophy at Leipgiz University. But he was expelled from there for being an atheist. He proceeded to Switzerland and completed his doctoral studies at the University of Zurich. He returned to India in 1883and subsequently taught at different colleges in Hyderabad, Mysore and Muzaffarpur. Towards the end of his life, he embraced Islam.

(http//:www.banglapedia.org)

دریافت کی عظمت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی دور کا واقعہ ہے۔ آپ کے چچا ابو طالب نے ایک بار آپ کو بلایا اور کہا کہ قوم کے ساتھ مصالحت کا انداز اختیار کرو (فاكفف عن قومك ما يكرهون من قولك)۔ اِس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: يا عمّ، لو وُضعت الشمس في يميني والقمر في يساري، ما تركت هذا الأمر (حياة الصحابة: 1/58) یعنی اے میرے چچا، اگر یہ لوگ ایسا کریں کہ وہ میرے دائیں ہاتھ میں سورج رکھ دیں اور میرے بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں، تب بھی میں اِس کام کو نہیں چھوڑوں گا۔

اِس واقعے سے ایک نہایت اہم اصول معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ — جتنی بڑی دریافت، اتنی بڑی عزیمت۔ اگر آدمی ایک ایسی حقیقت پر کھڑا ہوا ہو جو اس کے لیے سورج اور چاند سے بھی زیادہ بڑی ہے تو ہر دوسری چیز اس کی نظر میں چھوٹی ہو جائے گی۔ ایسا آدمی کسی بھی عذر کو لے کر اپنے موقف کے معاملے میں مصالحت کا انداز اختیار نہیں کر سکتا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن توحید کا مشن تھا۔ آپ کو توحید کا نظریہ وحیِ خداوندی کے تحت بطور اعلیٰ معرفت حاصل ہوا۔ اسی اعلیٰ معرفت کے تحت آپ اپنے مشن کو لے کر کھڑے ہوئے۔ آپ کی جو دریافت تھی، وہ آپ کے لیے ساری کائنات سے زیادہ بڑی تھی۔ ایسا انسان اس کا تحمل نہیں کر سکتا کہ وہ کسی مصلحت کی بنا پر اس کو چھوڑ دے یا وہ اس میں کوئی کمی کرے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ قول بھی ایک سنتِ رسول ہے۔ وہ ایک واقعے کی صورت میں ایک عظیم حقیقت کو بتاتا ہے، وہ یہ کہ ایک بڑی دریافت تمام دوسری چیزوں کو چھوٹا کر دیتی ہے۔ ایسا آدمی کسی قسم کے رکون (11:113) کا تحمل نہیں کر سکتا۔ اگر آپ کسی شخص کے اندر یہ بات پائیں کہ وہ قوم کے اندر برائی دیکھتا ہے، لیکن وہ اپنے مادی تحفظات کی بنا پر اس کی کھلی مذمت نہیں کرتا تو سمجھ لیجئے کہ اس کو جو چیز ملی ہے، وہ اتنی بڑی نہیں کہ ہر قومی یا دنیوی مصلحت اس کے لیے چھوٹی ہو جائے۔

کامیاب زندگی کا راز

مشہور سائنس داں البرٹ آئن اسٹائن (وفات: 1955) نے کہا تھا کہ انسانی زندگی بائیسکل چلانے کی مانند ہے۔ اپنا توازن برقرار رکھو اور تم محفوظ طور پر اپنی منزل پر پہنچ جاؤ گے:

Life is like driving a bicycle. Maintain your balance and you will safely reach your destination.

یہ قول بہت بامعنی ہے۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان کو دو طرفہ تقاضوں کے درمیان عمل کرنا ہوتا ہے۔ ایک طرف، اس کا اپنا ارادہ اور دوسری طرف، خارجی حالات۔

موجودہ دنیا میں کسی کامیابی کے حصول کے لیے دونوں تقاضوں کے درمیان ہم آہنگی ضروری ہے۔ اگر ارادہ ہو، لیکن خارجی حالات کی موافقت موجود نہ ہو تو کامیابی ممکن نہیں۔

اِسی طرح اگر خارجی حالات کی موافقت ہو، لیکن ارادہ موجود نہ ہو، تب بھی کامیابی ناممکن ہو جائے گی۔ آدمی کو چاہئے کہ جب بھی وہ اپنے کسی منصوبے کی تکمیل کرنا چاہے تو ہمیشہ وہ حالات پر پوری نظر رکھے۔ وہ ایسا نہ کرے کہ وہ اپنی خواہش کے پیچھے چلنے لگے۔ وہ ایسا نہ کرے کہ وہ کسی ایک پہلو کو نظر انداز کر کے دوسرے پہلو کی طرف بہت زیادہ جھک جائے۔ وہ ایسا بھی نہ کرے کہ وہ اپنا زیادہ اندازہ (overestimation) کرے اور حالات کا کم تر اندازہ (underestimation) کرنے لگے۔ اِس قسم کی کوئی بھی غلطی اس کے منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے کافی ہے۔ آدمی اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک انتہا پسند مخلوق ہے۔ آدمی اکثر ایسا کرتا ہے کہ وہ ایک پہلو کی طرف اِس طرح جھک جاتا ہے کہ وہ دوسرے پہلو کی رعایت کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ اِس قسم کے عدم توازن کے ساتھ کسی شخص کا اِس دنیا میں کامیاب ہونا ممکن نہیں۔

توازن بلاشبہہ ایک اہم اصول ہے، لیکن توازن سے مراد عملی معاملات میں توازن کا طریقہ اختیار کرنا ہے، نہ کہ فکری اور نظریاتی معاملات میں توازن کا طریقہ اختیار کرنا۔ نظری معاملات میں آدمی کا نشانہ آئڈیل ہونا چاہئے، لیکن عملی معاملات میں اس کو پریکٹکل بن جانا چاہیے۔

مواقع ختم نہیں ہوتے

فرنچ فلاسفر والٹیر (Voltaire) 1694 میں پیدا ہوا۔ آخر عمر میں اس کو سمومیتِ بول (urania) کی بیماری ہوگئی۔ وہ شدید تکلیف کی حالت میں 1778 میں مر گیا۔ اُس کا ایک قول یہ ہے— زندگی ایک تباہ شدہ جہاز کی مانند ہے، مگر ہمیں لائف بوٹ کے استعمال کو بھولنا نہیں چاہئے:

Life is a shipwreck, but we must not forget to sing in the lifeboats.

حقیقت یہ ہے کہ زندگی میں کبھی مواقع ختم نہیں ہوتے۔ ایک موقع (first chance) جب ختم ہوتا ہے تو اس کے فوراً بعد دوسرا موقع آجاتا ہے۔ ناکامی یہ ہے کہ آدمی ایک موقع کھونے کے بعد دوسرے موقع (second chance) کو دریافت نہ کرسکے۔

زندگی غیر متوقع حالات سے بھری ہوئی ہے۔ زندگی میں بار بار ایسے تجربات پیش آتے ہیں جن کی بابت آدمی نے پہلے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اس بنا پر آدمی کا ہر منصوبہ ناقص ثابت ہوتا ہے۔ اِس لیے ضروری ہے کہ آدمی بار بار اپنے منصوبے پر نظر ثانی کرے۔

اِس صورتِ حال کی تلافی کے لیے خالق نے دنیا کو امکانات اور مواقع سے بھر دیا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ جب وہ کسی ناکامی سے دوچار ہو تو وہ اپنی ناکامی کو تجربے کے خانے میں ڈال دے اور نیا راستہ تلاش کرکے اپنے سفر کو جاری رکھے۔ ناکامی صرف ناکامی نہیں، ناکامی آپ کی شخصیت کے ارتقا کا ذریعہ ہے۔ ناکامی آپ کو زیادہ دانش مند بناتی ہے۔ ناکامی آپ کی سنجیدگی میں اضافہ کرتی ہے۔ ناکامی آپ کو زیادہ پختہ انسان بنانے والی ہے۔ ناکامی زیادہ بڑی کامیابی کا دروازہ کھولنے والی ہے۔

انسان کی سب سے بڑی طاقت اس کی عقل ہے۔ عقل کو استعمال کرکے آدمی ہر مسئلے کا حل دریافت کرسکتا ہے، یہاں تک کہ ایسے مسئلے کا حل بھی جو بظاہر خاتمہ کے ہم معنی ہو، جس کے بعد کوئی امکان نظر نہ آتا ہو۔ ہمت کو ہمیشہ باقی رکھیے اور پھر عقل ہر صورتِ حال میں آپ کی رہنما بن جائے گی۔

غلطی کا اعتراف

موجودہ زمانے کا ایک معروف کلچر وہ ہے جس کو سروے کلچر (survey culture) کہا جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں لوگوں کی رائے جاننے کے لیے ہر چیز کا سروے کیا جاتا ہے۔ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (24 اپریل 2013) میں ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ انگلینڈ میں کیے گئے ایک سروے کے مطابق، ساری (sorry) کا لفظ بولنا لوگوں کے لیے ایک بے حد مشکل کام ہوتا ہے:

'Sorry' is the hardest word to say.

اسلام میں کچھ چیزیں واضح طور پر حرام قرار دی گئی ہیں۔ یہ گویا وہ چیزیں ہیں جو کہ محرّم حرام (declared *haram*) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر ان کے سوا کچھ چیزیں اور ہیں جو اگرچہ شرعی زبان میں حرام نہیں قرار دی گئی ہیں، لیکن وہ سخت طور پر غیر مطلوب ہیں۔ اِنھیں غیر محرّم چیزوں میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی کھلے طور پر اپنی غلطی کا اعتراف نہ کرے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق، غلطی کا اعتراف نہ کرنا آدمی کے اندر کمزور شخصیت پیدا کرتا ہے، اور کمزور شخصیت اور حرام شخصیت کے درمیان صرف قانون کے اعتبار سے فرق ہے، حقیقت کے اعتبار سے، دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

اِسی طرح سطحیت، بے اصولی، بد ذوقی اور غیر سنجیدگی جیسی چیزیں بھی سب کی سب غیر محرّم حرام کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اِس طرح کی عادتوں کے ذریعے آدمی کے اندر غیر جنتی شخصیت بنتی ہے۔ موجودہ دنیا میں کسی عورت اور مرد کا اصل کام یہ ہے کہ وہ اپنے اندر مزکّیٰ شخصیت بنائے۔ اِسی مزکّیٰ شخصیت کو آخرت کی زندگی میں جنت میں جگہ ملے گی۔ یہ مزکی شخصیت صرف حرام چیزوں کے پرہیز سے نہیں بنتی، بلکہ وہ اُس وقت بنتی ہے جب کہ اِس معاملے میں انسان اتنا زیادہ حساس ہوجائے کہ وہ غیر محرم حرام سے بھی شدت کے ساتھ پرہیز کرنے لگے (لا یبلغ العبد أن یکون من المتقین، حتی یدع ما لا بأس بہ حَذَراً مما بہ بأس)۔

سوال و جواب

سوال

میں ایک جدید تعلیم یافتہ مسلمان ہوں۔ میں پانچ وقت نماز پڑھتا ہوں اور روزہ بھی رکھتا ہوں، لیکن یہ تراویح جو ہر سال پڑھی جاتی ہے، اس کا کوئی فائدہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ براہِ کرم، اِس کی وضاحت فرمائیں۔ (ایک قاری، الرسالہ، نئی دہلی)

جواب

تراویح کوئی رسم نہیں ہے۔ تراویح دراصل، قرآن کا اجتماعی مطالعہ (collective study) ہے۔ تراویح کا مطلب یہ ہے کہ نماز کی حالت میں کھڑے ہوکر قرآن کو سنا جائے اور اس کا اجتماعی مطالعہ کیا جائے۔ تراویح کی بہترین صورت یہ ہے کہ کسی دن قرآن کا جو حصہ پڑھا جانے والا ہو، تمام نمازی پیشگی طور پر قرآن کے اُس حصے کا ترجمہ پڑھیں اور اس کے مضمون کو اپنے ذہن میں بٹھائیں۔ اِس کے بعد وہ مسجد میں جاکر تراویح پڑھیں۔ اِس طرح جب وہ تراویح پڑھیں گے تو وہ قرآن کو متوجہ ہوکر سنیں گے بھی اور اُس پر غور بھی کریں گے۔ یہ اُن کے لیے قرآن کا ایک اجتماعی مطالعہ ہوگا جس سے انھیں غیر معمولی فائدے حاصل ہوں گے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب زیادہ لوگ جمع ہوکر اللہ کا ذکر کریں اور اللہ کا چرچا کریں تو اُس وقت وہاں فرشتے بہت زیادہ تعداد میں آجاتے ہیں۔ فرشتوں کی آمد سے اُس مقام پر ایک روحانی ماحول پیدا ہوجاتا ہے۔ تراویح، اِسی قسم کا ایک اجتماعی ذکر اور اجتماعی مطالعہ قرآن ہے۔ اُس کو اگر صحیح طور پر انجام دیا جائے تو اُس سے غیر معمولی فوائد حاصل ہوں گے۔

سوال

قرآن میں اللہ کا ارشاد ہوا ہے: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (17:85) ۔ آپ ''تذکیر القرآن'' میں مذکورہ آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''یہاں روح سے مراد وحی الٰہی ہے۔ عرب کے جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا، وہ وحی والہام کے منکر نہ تھے۔ اس سوال کا رخ ان کے نزدیک،

رسول اللہ کی بے خبری کی طرف تھا، نہ کہ حقیقۃً اپنی بے خبری کی طرف‘‘ (صفحہ: 792) -آپ نے روح سے مراد ’’وحی الٰہی‘‘ لیا ہے، لیکن صحیح ترین روایات اور مفسرین کی تشریحات کی رو سے یہ تشریح درست نہیں -مثال کے طور پر ابن کثیر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ’’حضرت ابن عباس سے منقول ہے کہ یہودیوں نے پیغمبر سے روح کی بابت سوال کیا کہ اسے جسم کے ساتھ عذاب کیوں ہوتا ہے، وہ تو اللہ کی طرف سے ہے- چوں کہ اس بارے میں کوئی وحی آپ پر نہیں اتری تھی، اِس لیے آپ نے ان سے کچھ نہ فرمایا- اسی وقت آپ کے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور مذکورہ آیت اتری (جلد سوم، صفحہ 220) مولانا عبد الماجد دریابادی نے اپنی تفسیر (تفسیر ماجدی) میں سورہ بنی اسرائیل کی اس آیت کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ’’روح سے مراد روح انسانی ہے جو انسان کا سبب حیات ہے: في هذه الآية أقوال- أظهرها أن المراد من الروح الذي هو سبب الحياة (کبیر، جلد سوم، صفحہ: 72) -امید ہے کہ اس اشکال پر غور فرمائیں گے اور اپنے جواب سے مطلع کریں گے- (شاہد جمیل، کلکتہ)

جواب

اِس آیت میں ’’روح‘‘ سے مراد کیا ہے، اِس میں اختلاف ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، تفسیر القرطبی) قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر روح کا لفظ وحی کے معنی میں آیا ہے- اِسی کو ہم نے اختیار کیا ہے- مثال کے طور پر ملاحظہ ہو سورہ المومن (40) کی آیت نمبر 15-

سوال

عرض ہے کہ آپ کی فکر انگیز تحریروں کا مطالعہ 1986 سے مسلسل کر رہا ہوں اور دعوتی کام میں بھی مصروفِ عمل ہوں- آپ سے اس خط کے ذریعے کچھ ذہنی اشکالات کا فوری ازالہ چاہتا ہوں- اُمید ہے کہ آپ جواب مرحمت فرما کر میرے ان اشکالات کو دور کریں گے-

1- آپ دعوتی نقطہ نظر سے اکثر reasoning پر بہت زور دیتے ہیں، لیکن قرآن میں بہت سارے واقعات beyond reasoning ہیں- مثلاً اصحاب کہف کا واقعہ، حضرت سلیمان کے واقعات، حضرت عیسی کے واقعات، وغیرہ- میرا سوال یہ ہے کہ اگر ہم اسلام کے تمام حقائق کو

reason-based تصور کریں یا بنانے کی کوشش کریں تو کیا پورے اسلامی ڈھانچے پر شک پیدا نہیں ہوگا۔ اِسی طرح آپ نے لکھا ہے کہ حُب شدید کا تعلق صرف اللہ سے ہوتا ہے کسی اور سے نہیں۔ (الرسالہ، مئی 2013) اِس سے یہ نتیجہ اخذ ہو رہا ہے کہ پیغمبر کے ساتھ بھی اگر حب شدید ہو تو یہ مشرکین کا طریقہ ہے اور بالفاظِ دیگر یہ خدا کا حصہ پیغمبر کو دینے جیسا ہے۔ عرض ہے کہ جب اللہ تعالی نے رسول کی اطاعت کو اپنی اطاعت ٹھہرایا (4:80) اور سورہ الفتح میں فرمایا کہ ''جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں، وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں'' (48:10)۔ تو رسول کے ساتھ محبت درحقیقت اللہ ہی سے محبت کیوں نہیں ہے — مزید اللہ کے رسول کے ساتھ حُبّ شدید کی ممانعت ہوتی یا یہ مشرکوں کا طریقہ ہوتا تو حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اِس کی بات کیوں کرتے۔ ''میری امت میں مجھ سے شدید محبت رکھنے والے وہ لوگ ہیں جو میرے بعد پیدا ہوں گے۔ اُن میں سے ہر ایک کی خواہش ہوگی کہ کاش، وہ مجھے دیکھتا اور اپنے اہل وعیال اور اپنے مال کو فدا کرتا''۔

بخاری اور مسلم میں یہ حدیث درج ہے جس میں اللہ اور رسول کی محبت کو ایک ساتھ بریکیٹ کیا ہوا ہے: ''تین چیزیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں وہ ہوں، اُسے ایمان کی حلاوت نصیب ہوگی — یہ کہ اللہ اور اس کے رسول اُسے تمام ماسوا سے زیادہ محبوب ہوں'' (أن یکون اللہ ورسولہ أحب إلیہ مماسواھما) آپ نے الرسالہ، مئی 2011 میں وطن کے ساتھ محبت کو ایک قول سے استدلال کر کے اس کو ایمان واسلام کا تقاضا ثابت کیا ہے۔ اِس لحاظ سے رسول کی محبت یا دوسرے لفظوں میں رسول سے شدید قلبی تعلق کیسے مشرکانہ طریقہ بن جاتا ہے جب کہ صحابہ کے واقعات شاہد ہیں کہ ان کو پیغمبر کے ساتھ جو شدید قلبی تعلق تھا، وہ کبھی اللہ کی محبت اور اللہ کی عظمت میں آڑے نہیں آیا۔

3۔ آپ نے الرسالہ میں ایک بار لکھا تھا کہ آپ کے عقائد وہی ہیں جو اہلِ سنت والجماعت کے ہیں، لیکن ''نزول عیسیٰ'' اور ''شفاعت'' کے عقیدے کے متعلق آپ کی رائے مختلف ہے۔ کیا آپ کے ان دونوں عقیدوں پر یہ رائے حتمی ہے یا جس طرح دابۃ الأرض کے بارے میں آپ کی رائے تبدیل ہوگئی ہے، اِن دو عقیدوں کے بارے میں بھی آپ کی رائے تبدیل ہوسکتی ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ

براہِ کرم، ان اشکالات کا جواب دے کر میری رہنمائی فرمائیں۔ (الطاف حسین، کشمیر)

جواب

1۔ موجودہ زمانے کو ایج آف ریزن (age of reason) کہا جاتا ہے۔ موجودہ زمانے کے مائنڈ کو ایڈریس کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جو بات کہی جائے، وہ عقل پر مبنی (reason-based) ہو۔ تاہم عقلی استدلال کی دو سطحیں ہیں — ایک ہے مشاہداتی استدلال اور دوسرا ہے۔ استنباطی استدلال۔ اگر استنباطی استدلال کو شامل کرلیا جائے تو کوئی بھی چیز عقلی استدلال سے باہر نہیں رہتی۔ آپ نے جن تین چیزوں کا حوالہ دیا ہے، وہ بھی استنباطی استدلال کے دائرے میں پوری طرح شامل ہیں۔ استنباطی استدلال کا مطلب یہ ہے کہ ایسی چیز کے ذریعے استدلال کرنا جو اگرچہ براہِ راست دلیل نہ ہو، لیکن استنباط (inference) یا احتمال (probability) کے ذریعے وہ زیر بحث امر کو مدلل کر رہی ہو۔ تفصیل کے لیے حسب ذیل کتابیں ملاحظہ فرمائیں:

The Mysterious Universe by Sir James Jeans- 1930

The Encyclopaedia of Ignorance by Ronald Duncan & Miranda Weston-Smith- 1977

2۔ حبّ شدید مطلق طور پر صرف ایک ذات سے مطلوب ہے اور وہ اللہ رب العالمین کی ذات ہے۔ دوسروں سے محبت ہونا بھی فطری ہے، لیکن وہ محبت بالذات نہیں ہوتی، بلکہ وہ صرف بالواسطہ محبت ہوتی ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ماہنامہ الرسالہ، جون 2008، صفحہ: 3-2)

3۔ اہلِ سنت والجماعت سے وابستگی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی مسئلے پر اختلاف نہ ہو۔ اہلِ سنت والجماعت سے وابستہ ہونے کے باوجود رائے کا اختلاف فطری ہے۔ مثلاً چاروں فقہا یقینی طور پر اہلِ سنت والجماعت میں شامل ہیں، لیکن اُن کے درمیان بہت سے مسائل میں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔

ادارہ 'المورد' (لاہور، پاکستان) کی اردو اور انگریزی مطبوعات (میزان، البیان، وغیرہ) گڈورڈ بکس میں دستیاب ہیں۔ ان کو یہاں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔ الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

1- الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے کمیشن 33 فی صد ہے۔ 50 پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن 40 فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ 2- زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ 3- کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تین مہینے تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرتعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے		بیرونی ممالک کے لئے (ہوائی ڈاک)
ایک سال	Rs. 150	$20
دو سال	Rs. 300	$40
تین سال	Rs. 450	$60

Rahnuma-e-Zindagi
by
Maulana Wahiduddin Khan
ETV Urdu
Tuesday-Friday 5.00 am

ISLAM FOR KIDS
by
Saniyasnain Khan/Maria Khan
ETV Urdu
Every Sunday 9.00 am